مقالات

مولانا عبیداللہ سندھی سیمینار، کراچی

۱۹۹۴ء

مرتّب

ڈاکٹر ابو سلمان سندھی (شاہجہان پوری)

ناشر

مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی

کراچی

کتاب کا نام : مقالات مولانا عبید اللہ سندھی سمینار ۱۹۹۴ء

مرتب : ڈاکٹر ابو سلمان سندھی (شاہجہان پوری)

ناشر : مولانا عبید اللہ سندھی اکیڈمی پاکستان - کراچی

طابع : المجزن پرنٹرز (مکتبہ ، رشیدیہ) پاکستان چوک - کراچی ۷۴۲۰۰

اشاعت : ۱۹۹۴ء

قیمت : ...... روپے

ملنے کے پتے

(۱)

مکتبۂ شاہد

۱/۹، علی گڑھ کالونی، کراچی - ۵۸۰۰

(۲)

مکتبۂ شریفیہ

عائشہ منزل، نزد مسجد مقدس - اردو بازار

کراچی ۷۴۲۰۰

فہرست

تیسری نشست۔ ۹۔ ستمبر ۱۹۹۴ء (بعد نماز مغرب)

بیاد

امام انقلاب

مولانا عبید اللہ سندھی

(۱۸۷۲ء - ۱۹۴۴ء)

بموقعہ

پچاس سالہ یوم وفات

۲۲- اگست ۱۹۹۴ء

مولانا عبید اللہ سندھی نیشنل کمیٹی
پاکستان

فہرست اراکین

مولانا عبید اللہ سندھی نیشنل کمیٹی پاکستان

مولانا ابو سعید غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب		چیئرمین
ڈاکٹر ابو سلمان سندھی (شاہجہان پوری)		آرگنائزر
جناب محمد فاروق قریشی		سیکریٹری سمینار کمیٹی
مولانا عزیز اللہ جروار	(سکھر)	رکن
جناب قمر الدین سھتو	(کراچی)	رکن
مولانا حافظ قاری سعید الرحمن علوی	(سرگودھا)	رکن
جناب ضیاء اللہ کھوکھر	(گوجرانوالہ)	رکن
مولوی شبیر احمد خان میواتی	(لاہور)	رکن
جناب آصف بالادی	(حیدرآباد)	رکن
جناب ثناء اللہ سومرو	(شکارپور)	رکن

روداد سیمینار منعقدہ کراچی ۱۹۹۴ء

محمد فاروق قریشی

مولانا عبید اللہ سندھی نیشنل کمیٹی پاکستان نے امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے پچاس سالہ یوم وفات کی تقریب سے ایک یادگار پروگرام کا منصوبہ بنایا تھا، جس میں متعدد کتابوں کی تالیف وتدوین اور اخبارات ورسائل کے خاص نمبروں کی اشاعت کے علاوہ ملک کے مختلف شہروں میں سیمیناروں کا انعقاد بھی شامل تھا۔

اس سلسلے میں حضرت مولانا سندھی کی یاد میں اور ان پر تقریباً ایک درجن کتابوں کی تالیف وتدوین اور اشاعت کا انتظام کیا گیا۔ کئی اردو اور سندھی رسائل اور اخبارات کے نمبر شائع ہوئے اور لاہور، راولپنڈی، حیدرآباد میں سیمیناروں کے انعقاد کی اطلاعات ملی ہیں۔ ایک سیمینار برمنگھم (برطانیہ) میں منعقد ہوا تھا، جس کا انتظام مولانا ابو عمار زاہد الراشدی اور ان کے دوستوں نے کیا تھا۔ کراچی میں بھی ایک سیمینار کیا گیا تھا جو سیمینار کئی لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے۔ یہ سیمینار مولانا عبید اللہ سندھی نیشنل کمیٹی کے زیر اہتمام جمعیت طلباء اسلام کراچی کے تعاون سے ۸، ۹۔ دسمبر ۱۹۹۴ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس میں ملک کے نامور اہل قلم، علمائے کرام اور ممتاز سیاسی راہنماؤں کے علاوہ اہل ذوق اور عوام نے کثیر تعداد میں شرکت فرمائی۔

یہ دو روزہ پروگرام تھا، جسے تین نشستوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ سیمینار کی پہلی نشست ۸۔ ستمبر کو جمعرات کے دن نماز عصر کے بعد محترم حافظ فضل محمد صاحب سنیٹر کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ اس افتتاحی نشست کے مہمان خصوصی پاکستان کے

ممتاز سیاست داں جمعیت علماے اسلام کے ڈپٹی سیکریٹری جنرل حافظ حسین احمد صاحب تھے۔ اسٹیج سیکریٹری کے فرائض خاکسار (محمد فاروق قریشی، کراچی) نے ادا کیے جمعیت علماے اسلام صوبہ سندھ کے سیکریٹری اطلاعات جناب قاری محمد عثمان نے تلاوت کی اور پروگرام کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

سب سے پہلے "مولانا عبید اللہ سندھی نیشنل کمیٹی" کے آرگنائزر، معروف محقق اور کتب کثیرہ کے مولف و مصنف ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری نے سمینار کے انعقاد کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی اور موجودہ دور میں مولانا سندھی کے افکار کی معنویت اور پاکستان کے مخصوص حالات میں مولانا سندھی کے نظریات کی اہمیت پر اظہار خیال کیا۔ ان کے بعد محترم قمر الدین سہتو صاحب نے جو انگریزی، اردو اور سندھی کے اہل قلم اور دانش ور ہیں، اپنا مقالہ پیش فرمایا۔ محترم سہتو صاحب کا مقالہ بہت فکر انگیز تھا، جسے بہت پسند کیا گیا۔ سہتو صاحب کے بعد جمعیت طلباے اسلام کراچی کے سابق صدر جناب اکبر ہاشمی صاحب نے ایک مضمون پڑھا۔ پروفیسر آذر حفیظ صاحب کا مقالہ گورنمنٹ ڈگری کالج اورنگی ٹاؤن کراچی میں اردو کے لیکچرار انوار احمد صاحب نے پڑھا جو مولانا سندھی کے تصور انسانیت کے موضوع پر تھا۔ مولانا سندھی کے افکار میں متحدہ انسانیت کا ایک خاص تصور ہے جو نادر بھی ہے اور اہم بھی۔ یہ مقالہ دانشوروں کی توجہ خاص کا طالب ہے۔ مولانا سعید الرحمن علوی (لاہور) کو سمینار میں شریک ہونا تھا، لیکن وہ کسی وجہ سے خود تشریف نہیں لا سکے تھے، البتہ اپنا مقالہ انھوں نے بھیج دیا تھا۔ مقالہ بہت فکر انگیز تھا جسے خاکسار (محمد فاروق قریشی، کراچی) نے پڑھ کر سنایا۔ افسوس! آج جب سمینار کی روداد مرتب کر رہا ہوں، مولانا سعید الرحمن علوی صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ یہ حادثہ ۲۰۔ نومبر ۱۹۹۴ء کی صبح کو بھیرہ (ضلع سرگودھا) میں پیش آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ وہ علم اور اخلاق و سیرت کی بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ علوی صاحب کا مقالہ مفصل بھی

تھا اور فکر انگیز بھی۔ اس کے بعد اجلاس کے صدر سنیٹر حافظ فضل محمد صاحب نے "انقلاب اور اس کے بنیادی تقاضے" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ ان کے بعد اس افتتاحی نشست کے مہمان خصوصی سنیٹر حافظ حسین احمد صاحب نے حاضرین سے خطاب فرمایا۔ حافظ صاحب نے مولانا عبید اللہ سندھی کے ہمہ گیر اور بلند افکار پر روشنی ڈالی اور انسانیت کی بہبود کے سلسلے میں حضرت مولانا سندھی کے پروگرام کا ذکر کیا۔ مولانا کے مطالعے اور مشاہدے کی وسعت، اصابت رائے، وطن کی آزادی کے لیے ان کی خدمات، ان کی طویل جلاوطنی، ان کے ایثار اور قربانیوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا۔ حافظ صاحب نے مولانا سندھی کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔

حافظ صاحب نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ مولانا سندھی پر تصنیف و تحقیق کی سہولتیں بہم پہنچائے، مصنفین و محققین کی حوصلہ افزائی کی جائے، اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں ان کی شخصیت، افکار اور خدمات کا تذکرہ شامل کیا جائے، ان کے نام پر یونی ورسٹیوں میں چیئرز قائم کی جائیں، ان پر تحقیق کے لیے وظائف دیے جائیں، ان کی یاد میں ریسرچ لائبریری اور علمی، تحقیقی اور تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں۔

سمینار کی دوسری نشست ۹۔ ستمبر کو بعد نماز جمعہ پروفیسر محمد اسلم، سابق صدر شعبہ۔ تاریخ، پنجاب یونی ورسٹی (لاہور) کی صدارت میں شروع ہوئی۔ اس نشست کے مہمان خصوصی حضرت امام سندھی کے شاگرد مولانا عزیز اللہ جروار صاحب تھے۔ اسٹیج سیکریٹری کے فرائض جمعیت طلبائے اسلام کراچی کے سابق صدر اکبر شاہ ہاشمی نے انجام دیے۔ قرآن کی تلاوت مولانا ابو الکلام آزاد کے ایک شیدائی قاری محمد یونس نے ایسی خوش الحانی سے کی کہ سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ پہلا مقالہ مولانا عزیز اللہ جروار شہداد کوٹی کا تھا۔ ان کی طبیعت چوں کہ ناساز تھی اس لیے ان کے ایک رفیق احمد علی شیخ نے پڑھا۔ مولانا جروار صاحب کا مقالہ نہایت قیمتی خیالات اور بلند افکار پر مشتمل تھا۔

مولانا جروار صاحب کے بعد مولانا زاہد الراشدی صاحب کے مقالے کی باری

تھی۔ لیکن وہ ورلڈ اسلامک فورم کے تحت دنیا میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے سلسلے میں برمنگھم (لندن) میں تھے۔ انھوں نے ازراہِ عنایت اپنا مقالہ بھیج دیا تھا، جسے جمعیت علمائے اسلام ضلع شرقی (کراچی) کے امیر مولانا عبدالکریم عابد نے سمینار میں پیش کیا۔ راشدی صاحب نے اپنے مقالے میں اس الزام کا جائزہ لیا تھا کہ آیا مولانا سندھی اشتراکیت سے متاثر ہوگئے تھے؟ انھوں نے اس الزام کی نہ صرف پرزور تردید کی اس کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالی۔ اس کے بعد محترم محمد فاروق قریشی (لاہور) کا مقالہ پیش کیا گیا۔ قریشی صاحب بھی سمینار میں بہ ذات خود شریک نہیں ہوسکے تھے، لیکن انھوں نے اپنا مقالہ بھیج دیا تھا۔ مقالہ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے نظریہ قومیت پر تھا۔ ان کا مقالہ بہت عمدہ تھا اور بہت قابلیت سے لکھا گیا تھا۔ انھوں نے سرسید احمد خاں اور علامہ اقبال کے قوم اور وطن کے بارے میں ان خیالات کو بھی پیش کیا جن کو سامنے لانے اور ان پر بحث کرنے سے عام طور پر گریز کیا جاتا ہے۔ نیز بانی پاکستان کے ان خیالات پر بحث کی جو ان کے ایک خاص کشمکش کے دور کو چھوڑ کر اول و آخر حیات کے خیالات تھے، وہ جن کو پاکستان کی تعمیر کی بنیاد بنانا چاہتے تھے اور دو ٹوک الفاظ میں جن کا انھوں نے اعلان کر دیا تھا۔ قریشی صاحب کا مقالہ جمعیت طلبائے اسلام کراچی کے راہنما عبدالکریم عابد صاحب نے سامعین کے سامنے پیش کیا۔

اس کے بعد پروفیسر محمد اسلم کے صدارتی کلمات اور مولانا عزیز اللہ جروار صاحب کی دعا کے بعد سمینار کی دوسری نشست اختتام پذیر ہوئی۔

نمازِ مغرب کے بعد سمینار کی تیسری اور اختتامی نشست کی کارروائی ملک کے ممتاز عالم دین اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن (کراچی) کے استادِ حدیث ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی کی صدارت میں شروع ہوئی۔ اس نشست کے مہمان خصوصی جمعیت علمائے اسلام صوبہ سندھ کے نائب امیر جناب قاری شیر افضل خان صاحب تھے۔ سب سے پہلے جمعیت طلبائے اسلام پاکستان کے نوجوان صدر، جناب

عبدالرزاق عابد لاکھو صاحب نے وقت کے سیاسی اور علمی، فکری تقاضوں کے حوالے سے مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار و خدمات پر بہت پرجوش اور جذبات انگیز تقریر کی۔ اس کے بعد پہلے پروفیسر شفقت رضوی صاحب نے مولانا سندھی کے سرور اجیہ پارٹی کے پروگرام پر اپنا مفصل تحقیقی مقالہ پیش کیا، اس کے بعد ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری نے "مولانا سندھی کی خدماتِ سندھ پر ایک سرسری نظر" کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا۔ اس کے بعد پروفیسر محمد اسلم صاحب کا بلند پایہ مقالہ تھا۔ پروفیسر شفقت رضوی اور پروفیسر محمد اسلم، دونوں صاحبوں کے مقالے ایک ہی موضوع پر تھے۔ دونوں نے غور و خوض سے کام لیا تھا اور اپنے اپنے انداز میں اپنے مطالعہ و فکر کے نتائج کو مرتب کیا تھا۔ دونوں کا موضوع مولانا سندھی کا وہ پروگرام تھا جو انھوں نے ۱۹۲۴ء میں "کانگریس کمیٹی کابل کا سرور اجی نظام اور مہا بھارت سرور اجیہ پارٹی کا پروگرام" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ دونوں مقالے اہم معلومات اور نہایت بیش قیمت افکار سے مملو تھے۔ اس کے بعد مولانا محمد اسحق بھٹی صاحب کا مقالہ پیش کیا گیا۔ مولانا نے مولانا سندھی کے سوانح، تعلیمات اور خدمات کے سلسلے میں پروفیسر محمد سرور مرحوم کے علمی کاموں کا تعارف کرایا اور مولانا سندھی کے پہلے محقق و مصنف محمد سرور مرحوم کی شخصیت اور خدمات کا دلچسپ انداز میں جائزہ لیا۔ بعدہ نشست کے مہمان خصوصی محترم قاری شیر افضل نے مولانا سندھی کے سیاسی افکار اور عصر حاضر کے مسائل میں علما کے کردار کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ آخر میں صدرِ اجلاس مفتی نظام الدین صاحب نے مولانا عبیداللہ سندھی کے علمی اور فکری مقام کے حوالے سے اپنے قیمتی خیالات اور بلند افکار سے حاضرین کو مستفید فرمایا۔ صدارتی خطاب کے بعد جامعۃ العلوم الاسلامیہ (بنوری ٹاؤن، کراچی) کے استاد محترم مولانا مفتی عبدالسمیع صاحب نے رب ذوالجلال کے حضور دعا کی کہ وہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے درجات کو بلند فرمائیں اور ہمیں ان کے افکار و نظریات سے استفادہ کرنے کی توفیق ارزانی فرمائیں! آمین۔

قائدِ ملت امام انقلاب

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ

قائدِ ملت ، امامِ انقلاب
صاحبِ اوصاف بے حد و حساب

داعیِ فکرِ امام دہلوی
مصلحِ امت فقیہِ لاجواب

شارحِ اسرارِ قرآنِ مبیں
دیدہ ور ، بالغ نظر ، حکمت مآب

پستیِ امت کے غم کی آگ سے
جس کا سینہ ہو گیا جل کر کباب

حسرت و حرمان کی ظلمت میں جو
بن کے آیا آفتاب و ماہتاب

قوم کے محبوب و منظورِ نظر
دل فروز و دل ربائے شیخ و شاب

زندگی کی ہر مہم میں کامراں
زیست کے ہر مرحلہ میں کامیاب

شیخ سندھی عامل ام الکتاب
رہنما و رہبرِ راہِ صواب

آپ کا ہر فعل ایماں آفریں
روح پرور آپ کا قول و خطاب

باطل و فاسد عقیدے کر دیے
آپ نے سب آشکار و بے نقاب

عمر غربت میں گزاری بہرِ دیں
اور کیا حبِ وطن سے اجتناب

ریشمی رومال کی تحریک میں
کام آیا آپ کا حسن و شباب

ارتقا و حفظ ملت میں رہے
رنج و غم ان کے ہمیشہ ہم رکاب

چھوڑ کر باطل ، کیا حق اختیار
بارک اللہ ، ذالک الحسن المآب

عین پیری میں بالآخر ہو گئے
بارگاہِ کبریا میں باریاب

سرور میواتی

(لاہور)

پہلی نشست

۸۔ ستمبر ۱۹۹۴ء

صدر

سنیٹر حافظ فضل محمد صاحب

مہمان خصوصی

سنیٹر حافظ حسین احمد صاحب

مرکزی ڈپٹی سیکریٹری جمعیت علماے اسلام

مقالات



صدر

سنیٹر حافظ فضل محمد صاحب



مہمان خصوصی

سنیٹر حافظ حسین احمد صاحب

مرکزی ڈپٹی سیکریٹری جمعیت علماے اسلام

افتتاحیہ

حضرات گرامی قدر! آج ہم امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی زندگی، شخصیت، سیرت اور افکار و خدمات کے تذکرے اور انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ہمارا یہ مجمع حضرت مولانا کی پچاس سالہ یوم وفات کی تقریبات کا ایک حصہ ہے۔

حضرات! ہمارے بزرگوں کی زندگیاں تقویم کے ایام و شہور یا کسی کلینڈر ایئر کے کسی چھوٹے یا بڑے دن میں پیدائش و وفات کے تعلق سے تذکرے کی رہین منت نہیں۔ ان کی یاد کے لیے کسی خاص موسم یا فصل گل کی بھی ضرورت نہیں۔ ان کا وجودِ گرامی تاریخ کی ایک سچائی اور اللہ کی نشانیوں میں سے نشانی تھا، اس لیے کوئی موسم ہو، بہار و خزاں کا کوئی دور ہو ان کی یاد ہماری تعلیم و تہذیب کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ ہم ان کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہو سکتے۔

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ !

ان سب کی عظمت ان کی شخصیت کے حسن، سیرت کے محاسن، افکار کی بلندی اور قوم و وطن کی خدمات، قیام ملتِ اسلامیہ کے لیے ایثار اور احیائے اسلام کے لیے جان و مال کی بے مثال قربانیوں کی وجہ سے ہے۔ ان بزرگوں کی عظمت کا تعلق کسی خاص تاریخ و مقام میں پیدائش کی وجہ سے نہیں، لیکن قوم کے اس ذوق و عادت کو کیا کہا جائے کہ ہم نے نزول قرآن عظیم اور ولادتِ نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی

سعادتوں تک کو خاص ایام منانے کی رسم تک محدود کر دیا ہے ۔ ہماری قوم ان سعادتوں کے نزول اور ظہور و بعثت کے ایام کا جشن مناتی ہے ، لیکن افسوس کہ ان سعادتوں کے حصول کی سعی نہیں کرتی ۔ ہم ۱۴۔ اگست کو جشن آزادی مناتے ہیں ، ۲۳۔ مارچ کو یوم آزادی مناتے ہیں ، ۶۔ ستمبر کو یوم دفاع پاکستان مناتے ہیں ، لیکن یہ سب جشن منانے کے لیے مناتے ہیں اور جس شان کے ساتھ مناتے ہیں اسی شان کے ساتھ قیام پاکستان کے مقاصد اور تعمیر وطن کے تقاضوں سے دور ہوتے جاتے ہیں ۔ ہم مصور و معمار پاکستان کے یوم پیدائش و وفات کو بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں لیکن کیا ہم نے ان کی فکر اور سیرت کے محاسن کو تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہے ؟

حضرات ! ہم اس قسم کی یاد منانے کے قائل نہیں ، ہم تو اپنے اسلاف کی سیرت اور ان کے افکار کے محاسن کے جویا ہیں ۔ ہم ان کے روشن کارناموں اور عظیم الشان خدمات کو مشعل راہ بنانا چاہتے ہیں ۔ ہم اس عہدِ سعادت اور دورِ علم و تہذیب کی بازیافت کے لیے کوشاں ہیں ، جس کے سانچوں میں علم و عمل کے جامع اور ایثار و قربانی کے مجسمے اور اخلاق و سیرت کے یہ حسین پیکر ڈھلا کرتے تھے ۔

حضرات ! ہم صرف مولانا سندھی کی تنہا شخصیت کی یاد منانا اور یادگار قائم کرنا نہیں چاہتے بلکہ مولانا سندھی کے شیوخ ، اساتذہ اور ان کے معاصرین میں سے بے شمار شخصیات کی یاد منائیں گے ، لیکن اس طرح کہ ان کی یاد ہمارے دلوں میں ہو ، ان کے علوم و افکار سے ہمارے سینے معمور اور دماغ روشن ہوں ، ان کی زندگی ہمارے لیے نمونہ ہو ، ان کے کارنامے اور ایثار ہمارے لیے مشعل راہ ہوں ، یہاں تک کہ ہمارے نوجوانوں کی زندگیاں اپنے اسلاف کرام کی یادگار اور نمونہ بن جائیں ۔

حضرات گرامی قدر ! مولانا عبید اللہ سندھی اسلام کے خدمت گذاروں اور حق پرستوں کے جس قبیلے ، ایثار پیشہ گان ملت کے جس قافلے اور تجدید و احیاے اسلام کی تحریک کے جس سلسلۃ الذہب سے تعلق رکھتے تھے ، اس کی مختلف کڑیاں صدیوں پر

پھیلی ہوئی تاریخ کو محیط ہیں اور تاریخ کی روشنی نے گرد و پیش کے حالات کے اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے سے تابندہ تر بنا دیا ہے۔ ان میں سے ہر شخصیت مجمع الصفات ہے لیکن حضرات! اس وقت ہمارا موضوع اور اس سمینار کے انعقاد کا مقصد امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی کی شخصیت کا تذکرہ اور ان کے افکار اور کارناموں پر تبصرہ ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی شخصیت میں فیضان الہیٰ سے علم و عمل، فکر و سیرت، اخلاق و تہذیب کی بے شمار خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ ذہنی و دماغی بہت صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کے علم و فکر، سیرت اور خدمات ملت اسلامیہ اور تالیف و تدوین اور شرح و تفسیر علوم و فنون کی جو خوبیاں دنیا پر ظاہر ہوئیں اور اصحاب علم و نظر نے جن کا اعتراف کیا، وہ یہ تھیں کہ مولانا سندھی ایک مستند اور بلند پایہ عالم دین تھے، فقہ و حدیث اور تاریخ عالم و اسلام میں ان کی گہری نظر تھی، علوم قرآنی کے وہ بے مثال عالم تھے، وہ بلند پایہ مفسر قرآن تھے اور تفسیر میں ایک خاص انداز و دبستان فکر کے مالک تھے جسے مفکر ملت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ نے صوفیہ کے طریق تفسیر التعلیل و التعبیر سے مماثل قرار دیا ہے۔ وہ حکیم الہند امام ولی اللہ دہلوی کے علوم و معارف کے سب سے بڑے محقق و شارح تھے اور ان کی اس خوبی کا ان کے نکتہ چینوں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ انھیں ایک بڑی سعادت یہ حاصل تھی کہ وہ بہ واسطہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن جدید ہندوستان کی سب سے بڑی علمی اور احیائے اسلام و قیام ملت کی عظیم الشان ولی اللہی تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔ مطالعہ۔ علوم میں اور ملک کی سیاست میں حضرت شیخ الہند نے ان کی رہنمائی اور تربیت فرمائی تھی۔ انھوں نے وطن اور خصوصاً مسلمانوں کی تعلیم و اصلاح کے لیے مختصر اور طویل متعدد اسکیمیں بنائیں جن کی صرف نظری حیثیت ہی نہیں عملی اہمیت بھی تھی۔ ان کا علمی مطالعہ بہت گہرا اور تجربہ و مشاہدہ نہایت وسیع تھا۔ انھوں نے زندگی کے نشیب و فراز اور کئی ممالک و اقوام کے انقلاب کو اتنے قریب سے دیکھا تھا کہ کم از کم ہندوستان پاکستان

کے کسی سیاسی رہنما کو یہ موقع نہیں ملا تھا۔ انھوں نے پوری نصف صدی اسلام، مسلمانوں اور اہل وطن کی خدمت میں بسر کی تھی۔ یہ امتیاز برصغیر کے شاید ایک ہی دو رہنماؤں کو حاصل ہوا ہوگا۔ انھوں نے ملک کی آزادی کے لیے اور لیلیٰ وطن کے عشق میں پوری ربع صدی جلاوطنی کی زندگی گزاری تھی۔ یہ بھی ان کا ایک ایسا امتیاز تھا جس میں پورے برصغیر ہند و پاکستان کے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں ایک دو کے سوا کوئی ان کا شریک نہ تھا۔

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم ۱۸۷۲ء میں سیال کوٹ (پنجاب) کے ایک گاؤں چیاں والی میں ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۶ برس کی عمر میں انھوں نے اسلام قبول کیا، ۱۸۹۷ء میں دار العلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، پچھلی صدی کے آخری تین برس انھوں نے امروٹ شریف (سندھ) میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں بسر کیے۔ اسی زمانے میں انھوں نے سیاسی زندگی کا آغاز کیا، ۱۹۰۱ء میں دار الارشاد کے نام سے گوٹھ پیر جھنڈا میں مدرسہ قائم کیا۔ ۱۹۱۰ء میں حضرت شیخ الہند نے انھیں دیوبند طلب فرمایا اور دار العلوم کے طلبہ کی تنظیم کا کام سپرد کیا۔ مولانا سندھی نے جمعیت الانصار کے نام سے ایک انقلابی جماعت قائم کی۔ ۱۹۱۳ء میں نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے دہلی میں مدرسہ قائم کیا۔ ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہند کے حکم سے کابل (افغانستان) تشریف لے گئے۔ کابل میں انھوں نے ہندوستان کی آزاد عارضی حکومت کے قیام میں حصہ لیا، جنود ربانیہ (نجات دہندہ فوج) کی تشکیل کی۔ ملک سے باہر پہلی کانگریس کمیٹی قائم کی۔ وہ عارضی حکومت میں وزیر داخلہ تھے، نجات دہندہ فوج کے بانی اور قائم مقام جنرل تھے اور کانگریس کمیٹی کابل کے بانی صدر تھے ۱۹۱۹ء کی جنگ افغانستان مولانا سندھی کے منصوبہ کے مطابق لڑی گئی، جس کے نتیجے میں افغانستان آزاد ہو گیا۔ مولانا سندھی کو اس کی قیمت میں افغانستان چھوڑنا اور ایک نئے ملک میں جلاوطنی کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ ۱۹۲۲ء میں روس پہنچے اور تقریباً سات ماہ ماسکو

میں مقیم رہے۔اس دوران میں روسی انقلاب اس کے فلسفے اور اس کے پس منظر اور پیش منظر کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا، جولائی ۱۹۲۳ء میں روسی حکومت کے ساتھ ایک معاہدے کے بعد وطن عزیز کی آزادی کے ایک خفیہ منصوبہ کے تحت ترکی پہنچے اور تین سال استنبول میں مقیم رہ کر جدید ترکی کی سیاست اور اس کے پس منظر کا مطالعہ کیا۔ اس دوران میں انھوں نے برصغیر پاک وہند کے سیاسی مسئلے کا ایک حل دریافت کیا اور برصغیر کے لیے سیاسی نظام پر مبنی ایک جامع الاطراف اسکیم تیار کی۔اس اسکیم میں ملک کے فرقہ وارانہ، مذہبی، لسانی، اقتصادی، معاشی، تعلیمی، تہذیبی اور ریاستوں اور علاقوں اور صوبوں کے ہمہ قسم کے چھوٹے بڑے مسائل کا حل پیش کیا۔اس میں مسلمانوں اور دوسری چھوٹی قومیتوں کے خدشات کو دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی اہمیت کا اعتراف وقت کے مسلمان اور غیر مسلمان زعمانے کیا ہے۔جن میں مولانا محمد علی، شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، علامہ اقبال، پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ شامل ہیں۔اس کی جامعیت اور افادیت کے مقابلے میں نہ تو نہرو رپورٹ پیش کی جاسکتی ہے، نہ علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد، نہ مسلم لیگ کی پاکستان اسکیم، نہ قراردادِ لاہور کہ وہ تفصیلات سے عاری محض ایک قرارداد تھی۔اب جب کہ برصغیر پاک وہند کے مطلع سے گزشتہ دورِ سیاسیات کے جذبات کے بادل چھٹ رہے ہیں اور نوجوانوں میں جذبات سے الگ ہو کر تاریخ کے مطالعے کا ذوق پیدا ہو رہا ہے، مولانا سندھی کے اس انقلابی منصوبے کے مطالعہ وتجزیہ کی طرف توجہ ہوئی ہے اور متعدد اہل قلم اور اصحابِ علم ونظر نے اس منصوبے کی اہمیت اور افادیت پر نقد وتبصرہ کا قلم اٹھایا ہے۔

۱۹۲۶ء میں حج کے موقعے پر موتمر اسلامی میں شرکت کے لیے متعدد زعمائے ملت حجاز پہنچنے والے تھے۔مولانا نے فیصلہ کیا کہ انھیں ملک کے ان اہل نظر اور اصحابِ تدبر سے رابطہ پیدا کرنا چاہیے۔مولانا حجاز روانہ ہو گئے لیکن مختلف اسباب کی

بنا پر انھیں راستے میں اتنی دیر ہو گئی کہ موتمر ختم ہو گئی تھی اور زعما وطن لوٹ گئے تھے مولانا نے سیاسی کام نہ کرنے کے وعدے پر حجاز میں پناہ حاصل کر لی اور ساڑھے بارہ برس مکہ مکرمہ میں قیام کیا۔ یہ تمام عرصہ انھوں نے امام ولی اللہ دہلوی اور اس سلسلے کے دوسرے بزرگوں کی تصنیفات کے مطالعے، قرآن حکیم میں نظر و تدبر، تاریخ اور عالمی سیاسیات کے مطالعے اور درس و تدریس کے مشاغل میں بسر کیا۔ اس عرصے کے مطالعہ و تدبر علوم و افکار ولی اللہیٰ میں ان کا رسوخ و تبحر بہت پختہ ہو گیا تھا۔ انھیں بعض دوستوں کی عنایت سے ہندوستانی اخبارات و رسائل اور ہر طرح کی کتابیں پڑھنے کو مل جاتی تھیں اور عمرہ و حج کو پہنچنے والے مسافران حجاز کے ذریعے ان حالات سے بھی واقفیت ہو جاتی تھی، جن کے لیے اخبار اور رسائل و کتب کا مطالعہ کافی نہیں ہو سکتا تھا۔

مولانا سندھی نے مکہ مکرمہ کے دوران ہی میں غور و فکر سے جلاوطنی کے خاتمے کے بعد وطن میں کام کرنے کا ایک ہمہ جہت منصوبہ بنا لیا تھا، جس کا اظہار انھوں نے جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی کے سیاسی پروگرام، بیت الحکمت کے علمی و تعلیمی منصوبے، کانگریس میں فکر ولی اللہیٰ پر مبنی اپنی پارٹی بنانے اور جمعیت علمائے ہند کے لیے نئے نظام کار کی تجویز کے سلسلے میں ہوا ہے۔

۱۹۳۱ء کی سول نافرمانی کی تحریک نے برطانوی حکومت کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر نظر ثانی کرے۔ مسلمان اور غیر مسلمان انقلابی قوموں نے برٹش استعمار کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ۱۹۳۵ء کی آئینی اصطلاحات، انتخابات، صوبائی قومی حکومتوں کے قیام، پھر جنگ عظیم ثانی کے ملک کی سیاسیات پر مثبت اور منفی اثرات نے برطانوی استبداد کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اسی دوران میں جب کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد صوبائی ملکی حکومتوں کا

قیام عمل میں آیا تھا مولانا سندھی نے وطن واپس لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اس وقت ان کا وطن میں ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے انگریز حکومت کی یہ شرط مان لی کہ وہ تشدد اور قوت کے ذریعے سے انقلاب لانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ کانگریس کے فلسفہ، عدم تشدد کے پابند رہیں گے، لیکن انھوں نے اپنے جی میں، جیسا کہ ملک واپس آنے کے بعد ان کے اعلان و عمل سے ثابت ہوا، یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ اپنی قوتوں کو کانگریس کے حوالے کر دینے کے بجائے کانگریس میں ایک انقلابی اور ترقی پسند جماعت بنانے اور کانگریس کو اس کے پروگرام کے مطابق چلانے کی کوشش کریں گے۔ چناں چہ اس فیصلے کے مطابق حکومت سندھ کی ضمانت پر اللہ بخش شہید سومرو کی وزارت کے زمانے میں وہ وطن واپس آ گئے۔ ۷۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو انھوں نے ۲۵ برس کی جلاوطنی کے بعد کراچی کے ساحل پر قدم رکھا تھا۔

اس تاریخ کے بعد ان کی وفات تک زندگی کے تمام شب و روز ملک کی آزادی، قوم کی تربیت اور ملت کی غم گساری میں بسر ہوئے۔ اس زمانے میں انھوں نے جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی کو عملاً قائم کیا اور سندھ کے اہل ہمت اور وطن کی خدمت کے شائقین کو سرگرم عمل کیا۔ جمعیت خدام الحکمت کے نام سے انسانی خدمت گزاروں کی تنظیم قائم کی، ملک کو فرقہ واریت سے بچانے کے لیے جدوجہد کی، کانگریس کو گاندھی ازم کے سانچوں میں ڈھل جانے سے روکا، مسلمان انقلابی جماعتوں کو رجعت پسندی کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی اور رجعت پسند مسلمان جماعتوں کو مذہب کے نام پر سیاست میں زہر گھولنے اور فضا کو مسموم بنانے سے باز رہنے کی تلقین کی۔ لیکن ٹھیک اس وقت جب وہ یہ سیاسی اعمال انجام دے رہے تھے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے فرائض سے غافل نہ تھے۔ اس سلسلے میں بیت الحکمت کے نام سے یادگار شیخ الہند مولانا محمود حسن دہلی میں قائم کی اور اس کی شاخیں، لاہور، کراچی، گوٹھ پیر جھنڈا، امروٹ اور دین پور میں قائم کیں۔ مدارس اسلامیہ کے قیام اور تعلیم کی

اشاعت کی تحریک پیدا کی۔ وہ شب و روز قوم و وطن کی خدمت اور قیام ملت اسلامیہ کے انھیں عظیم الشان کاموں میں مصروف رہے، تاآں کہ وقت موعود نہ آپہنچا اور ۲۲۔ اگست ۱۹۴۴ء میں دین پور میں انھوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

حضرات! مولانا عبید اللہ سندھی کی زندگی کا یہ مختصر خاکہ ہے۔ آج ہم ان کی یاد منانے، ان کی شخصیت کی عظمت کا اعتراف کرنے اور ان کے افکار و خدمات کے تذکرہ و تبصرہ کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ دو روز میں تین نشستوں کا انتظام کیا گیا ہے جس میں مولانا سندھی کی شخصیت اور افکار و خدمات کے مختلف پہلوؤں پر بہت سے مقالے پیش کیے جائیں گے۔

حضرات! مولانا سندھی کے مطالعے کی اہمیت کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو گزشتہ تاریخ سیاست ملت اسلامیہ، ہندیہ کے حوالے سے، دوسرے وقت کے قومی، لسانی، مذہبی، تہذیبی، صوبائی، علاقائی، اقتصادی، معاشی مسائل کے حوالے سے۔ مولانا سندھی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ سندھ کے لوگوں سے عقیدت و ارادت کا رشتہ استوار کیا۔ یوپی کے اضلاع دیوبند، لکھنو، رام پور، گنگوہ، دہلی کے اساتذہ سے تعلیم پائی۔ سندھ کی سرزمین کو خدمت علمی کے لیے میدان منتخب کیا اور اپنے آپ کو سندھی کہلوانے اور لکھنے میں فخر محسوس کیا۔ مولانا سندھی محض ملائے مکتبی نہ تھے، وہ ایک روشن خیال اور بالغ نظر رہبر بھی تھے۔ تاریخ اسلام اور عالم اسلام کی علمی، فکری اور اقوام عالم میں اقتصادی، معاشی تحریکات اور سیاسیات میں گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ ولی اللہی مکتبہ فکر کی بہت اہم شخصیت تھے اور خود ایک نظام فکر کے مالک تھے۔ ان کے نظام فکری میں فرد کی تعلیم و تربیت سے لے کر متحدہ انسانیت کے قیام تک زندگی کے تمام درجوں اور سطحوں کے لیے ان کی قدر و اہمیت کے مطابق ہر چیز کا ایک مقام تھا۔ ان کے اندازِ فکر اور افادات و افکار میں ہمارے لیے وقت کی بہترین رہنمائی ہے۔

مولانا سندھی کے تذکرے میں یہ سمینار آئندہ انھیں بھول جانے کے لیے منعقد

نہیں کیا گیا بلکہ یہ ایک علمی اور فکری تحریک کا آغاز ہے۔ مولانا سندھی اس سلسلے کی آخرت شخصیت نہیں جن پر سمینار کا انعقاد کیا اور تصنیف و تالیف اور تدوین افکار کا پروگرام مرتب کیا گیا ہے، بلکہ مولانا سندھی کے سلسلہ، اکابر و اسلاف، مشائخ عظام اور اساتذہ، کرام اور ان کے معاصرین پر جو ولی اللہی مکتبہ، فکر سے تعلق رکھتے ہیں، سب پر حالات و وسائل کی وسعت کے مطابق سمینار بھی مرتب کیے جائیں گے اور تالیف و تصنیف کے کام بھی انجام پائیں گے۔

حضرات گرامی قدر! میں جمعیتِ طلباے اسلام (صوبہ، سندھ، کراچی) کے ارکان و کارکنان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے مولانا عبید اللہ سندھی نیشنل کمیٹی سے اس سمینار کے انعقاد میں تعاون کیا۔ میں ان حضرات کا بھی شکر گذار ہوں جنھیں مولانا سندھی کی عقیدت اور ارادت اس سمینار میں کھینچ لائی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ٥

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

عظیم انقلابی اور مصلح

قمر الدین سہتو

مولانا عبید اللہ سندھیؒ بیسویں صدی میں برصغیر کی آزادی کے صف اول کے مردِ مجاہد اور اسلامی دنیا کے عظیم انقلابی مفکر تھے۔

۱۸۷۲ء میں سیالکوٹ کے سکھ گھرانے میں باپ کے انتقال کے تین ماہ بعد ایک ایسا یتیم بچہ پیدا ہوا جس کو اسلام کی لگن نے مولانا سندھی بنادیا۔ اس نے ساری زندگی اسلام اور انسانی ذات کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ زندگی بھر مسلمانوں کی ثقافتی اور سیاسی بہتری اور برتری کے لیے جانفشانی سے کام کرتے رہے۔

۱۵ برس کی چھوٹی سی عمر میں اسلام جیسی نعمت سے مشرف ہونے کے بعد ان کو حافظ محمد صدیق بھرچونڈی کی صحبت اور محبت نصیب ہوئی اور تھوڑے عرصے کے بعد دین پور کے صوفی بزرگ حضرت غلام محمد کی صحبت سے بھی فیضیاب ہوئے۔ دونوں بزرگوں کی صحبت نے ان کی زندگی کو پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگ دیا۔ ۱۸۸۸ء میں اسلامی علوم کا عشق انھیں دارالعلوم دیوبند لے گیا۔ جہاں وہ وقت کے جید علما سے مستفیض ہوئے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن کی ان پر خاص توجہ ہوئی اور وہ بلند پایہ عالم بن گئے۔

۱۸۹۱ء میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ ۱۹۰۸ء تک سندھ میں درس دیتے رہے۔ اس دوران میں انھوں نے دو کتابیں ایک "حدیث" پر اور دوسری "جہاد" پر

لکھیں جو شیخ الہند کو دکھانے کے لیے دیو بند گئے۔ انھوں نے ان کے کام کو بہت پسند فرمایا۔

۱۹۰۸ء میں شیخ الہند نے مولانا سندھیؒ کو سندھ سے دیو بند بلا لیا اور خاص کام سپرد کیا۔ وہ چار سال تک جمعیت الانصار کے تحت دار العلوم کے قدیم طلبہ کی تنظیم اور موجودہ طلبہ کی سیاسی تعلیم و تربیت کا کام خاموشی کے ساتھ کرتے رہے۔ جب انھیں دیو بند میں کچھ مشکلات پیش آئیں تو شیخ الہند کے حکم پر انھوں نے کام کا مرکز دہلی منتقل کر دیا جہاں انھوں نے نظارۃ المعارف کی بنیاد ڈال کر کام شروع کیا۔ اس دوران میں ان کا بڑے سیاسی رہنماؤں مثلاً حکیم اجمل خان، نواب وقار الملک، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر سے رابطہ رہا اور دوسری انقلابی پارٹیوں سے بھی رابطہ قائم رکھا تھا۔

برصغیر کی آزادی کی خاطر مولانا سندھی ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۹ء تک (تقریباً ۲۵ برس) جلاوطن رہے۔ شیخ الہند کو ان پر مکمل بھروسا تھا، اس لیے ان کو افغانستان میں اپنا نمائندہ (خلیفہ) بنا کر بھیجا تھا تاکہ وہاں پر جماعت کو منظم کریں۔ مولانا نے سات سال تک افغانستان میں رہ کر کام کیا، وہ عارضی حکومت ہند کے ہوم منسٹر بنے، جب کہ مہندر پرتاپ صدر تھے اور مولانا برکت اللہ وزیر اعظم تھے۔ افغانستان کے حکمران اور امرا ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ انھوں نے امیر امان اللہ خان کے مشیر خاص کے فرائض انجام دیے اور ان کو انگریزوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا۔ جنگ ہوئی اور خود جنگ میں حصہ لیا۔ اس کے نتیجے میں افغانستان آزاد ہوا اور برصغیر کی آزادی کی راہ ہموار ہوئی۔ اس ساری کارروائی میں مولانا سندھیؒ کا خصوصی کردار شامل تھا۔ مولانا ریشمی رومال تحریک کے محرک تھے۔ تحریک تو ناکام ہوئی لیکن اس تحریک نے انگریزی حکومت کی بنیاد ہلا دی۔

۱۹۲۲ء میں مولانا سندھی کابل کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے روس گئے۔ وہاں

سرکاری مہمان کی حیثیت سے ۹، ۱۰ ماہ قیام کیا اور کام کیا۔ وزیر خارجہ چیچرن سے چار ملاقاتیں کیں جن میں برصغیر کو آزاد کرانے کا معاہدہ ہوا اور روس سے قرضہ لینا طے ہوا ماسکو میں قیام کے زمانے میں مولانا نے روسی انقلاب کا مطالعہ کیا اور اسلامی انقلاب کی برتری ثابت کر دی۔ ۱۹۲۳ء میں مولانا روس سے ترکی پہنچے جہاں بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر انھوں نے سرواجیہ پارٹی کی بنیاد رکھی اور منشور بنایا جس کی نقول برصغیر کے مختلف علاقوں میں روانہ کر دیں۔ ۱۹۲۶ء میں حج کے موقعے پر مکہ مکرمہ میں ایک اسلامی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھانے اور پرانے احباب سے ملنے کی خاطر مولانا استنبول سے مکہ روانہ ہوئے۔ لیکن کانفرنس ختم ہو جانے کے بعد وہاں پہنچے۔ حجاز میں تقریباً ۱۲۔۱۳ برس آپ کا قیام رہا جہاں اپنی مصروفیات کے متعلق آپ فرماتے ہیں:

> "میں نے پوری توجہ قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعے پر مرکوز کر دی۔ امام ولی اللہ کے فلسفے کی روشنی میں کئی مشکل مسئلے حل ہو گئے۔ اس قیام کے دوران میں نے یہ معلوم کر لیا کہ حقیقتاً قرآن مجید انسان کو زندگی کا مکمل پروگرام دیتا ہے۔ ایسی سمجھ پیدا ہونے میں یقیناً ان مقدس مقامات کا اثر شامل ہے۔ جہاں ہر وقت رحمت خداوندی برستی رہتی ہے۔"

مکہ کے قیام کے دوران میں مولانا سندھی کا درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ مختلف ممالک کے لوگ درس میں شامل اور مستفیض ہوتے اور کئی علما کو مولانا نے قرآن کی تفسیر عربی، اردو اور سندھی زبانوں میں پڑھائی اور املا کرائی۔ ممتاز علما کرام میں (جن کو مولانا سندھی نے تفسیر املا کرائی تھی) یہ علما سر فہرست ہیں:

۱۔۔۔ علامہ موسیٰ جار اللہ، روسی عالم — جن کو عربی میں تفسیر الہام الرحمن املا کروائی

۲۔۔۔ مولانا عبداللہ لغاری — جن کو اردو میں تفسیر مقام محمود املا کروائی

۳۔۔۔ مولانا محمد مدنی — جن کو سندھی میں تفسیر املا کروائی

اور بہت سے لوگوں نے تفسیر قرآن میں حضرت مولانا سندھی سے استفادہ کیا تھا۔ان میں ظفر حسن ایبک بھی شامل ہیں۔

علامہ موسیٰ   اللہ روس کے بڑے عالم دین تھے جن کی لکھی ہوئی کتابیں مصر کی یونیورسٹی میں پڑھائی جاتی تھیں۔روس میں مولانا سندھی نے ان کے یہاں قیام بھی فرمایا تھا۔وہ جب روس سے جلاوطن کر دیے گئے تو مکہ پہنچے۔مولانا سندھی نے ان کی درخواست پر انھیں شاہ ولی اللہ دہلوی کے فلسفے سے آشنا کیا اور حجتہ اللہ البالغہ پڑھائی۔ مولانا سندھی کی وطن واپسی سے پہلے ہی موسیٰ جار اللہ ہندوستان آگئے تھے اور انھوں نے علما کو بتایا:

> "مولانا سندھی ایک بڑے مجتہد عالم اور مجدد ہیں اور ایک اعلیٰ پائے مفسر قرآن ہیں۔میں نے مکہ کے قیام کے دوران میں ان سے استفادہ کیا ہے اور انھوں نے مجھے تفسیر املا کروائی ہے جو میں اپنے ساتھ لایا ہوں۔"

س ارض مقدس حجاز میں ۱۲، ۱۳ سال قیام کے بعد مولانا سندھی وطن واپ تشریف لائے۔وہ ۷۔مارچ ۱۹۳۹ء کو کیماڑی بندرگاہ کراچی پہنچے تو ان کا والہانہ استقبال کیا گیا۔سندھ کے وزیر اعلیٰ اللہ بخش سومرو، ممبران اسمبلی، کانگریس کمیٹی، مسلم لیگ اور جمعیت علماے ہند کے ممبران، خاکسار تحریک کے کارکن اور عوام بڑی تعداد میں استقبال کرنے آئے تھے۔

وطن عزیز میں واپس آنے کے فوراً بعد ہی مولانا نے قرآنی تعلیم پھیلانے اور تعلیمی ادارے قائم کرنے کے لیے عوامی رابطہ شروع کر دیا۔مثال کے طور پر ۱۱۔مارچ ۱۹۳۹ء کو کراچی کے میئر اور شہریوں کی طرف سے ان کو استقبالیہ دیا گیا اس کے بعد ۳۰۔مارچ ۱۹۳۹ء کو دیوبند کانفرنس میں اور ۶۔اپریل کو دہلی کانفرنس میں شرکت کی۔ پھر ۳۔جون ۱۹۳۹ء کو کلکتہ میں جمعیت علماے ہند کی کانفرنس کی صدارت کی اور اجلاسوں سے خطاب کیا۔اس کے علاوہ کئی اجتماعات اور علما و طلبہ کے وفود اور

جماعتوں سے روزانہ مخاطب ہوتے اور لوگوں کو قرآنی انقلاب کی طرف بلاتے۔ ایک خطاب میں آپ نے فرمایا:

"ہم مکہ مکرمہ اور اللہ کے مقدس گھر کو چھوڑ کر اپنے وطن میں جو غیروں کا محکوم ہے، واپس آئے ہیں، یہ مقصد لے کر کہ یہاں پر کچھ لوگوں سے ملیں گے جو قرآنی تعلیمات سننے کے لیے تیار ہیں۔ ہم لوگوں کو قرآن کے مطابق انقلاب کی دعوت دیتے ہیں۔"

• مولانا سندھیؒ نے شاہ ولی اللہ کے فلسفے اور تعلیم کو پھیلانے کا پروگرام بنایا اس کے لیے دہلی اور لاہور میں مرکز قائم کیے۔ علاوہ ازیں انھوں نے پیر جھنڈا، حیدر آباد (سندھ)، کراچی، لاہور، دین پور (بہاول پور) میں بیت الحکمت کے نام سے مدرسے قائم کیے۔ آپ نے اپنی تحقیقات کا خلاصہ اس طرح بیان کیا ہے:

"ابھی، ہماری تحقیقات کا خلاصہ جو ہمیں ذہن نشیں ہوا ہے اس کا پہلا درجہ قرآن و حدیث کی تعلیم ہے جس کو ہم خلافت باطنہ کہتے ہیں۔ قرآن کی صحیح تعلیم ظلم کی بالکل اجازت نہیں دیتی۔ یہ تعلیم سرمایہ داری کی جڑیں اکھاڑ دیتی ہے، شہنشاہی کے حقوق کسی بھی آدمی یا کسی جماعت کے لیے جائز نہیں مانتی۔ یہ درجہ فقط اللہ کی ذات میں حصر کر دیا ہے۔ اس تعلیم کے مطابق جو خلافت ظاہرہ قائم ہو گی وہ موروثی نہیں ہو گی، استبدادی نہ ہو گی۔ شورائی حکومت قانون اساسی کے ماتحت ہر قوم کی مساوات کی مالک خلافت کہلائے گی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ حکومت سوشلسٹ حکومت ہو گی کیوں کہ اصول ثانویہ میں یورپ میں اور مسلمانوں میں نمایاں فرق ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ شہنشاہی مستبد اور سرمایہ دارانہ نہیں ہو گی۔ اور یورپ کی حکومت سے جو قریب اس طرح کی حکومت ہے وہ سوشلسٹ حکومت ہے جس کا مذہب اس کو جنگ کرنے سے نہ روکتا ہو۔ یہ ہے، ہماری ساری عمر کی تحقیقات کا خلاصہ۔"

(ماخوذ از تمہید سورۃ الرعد، تفسیر از مولانا سندھیؒ)

مولانا سندھیؒ نے تحقیقات کے خلاصے میں خلافت باطنہ اور خلافت ظاہرہ کا

بیان کیا ہے۔ مولانا نے سورۃ الرعد میں خلافت باطنہ کی تنظیم پر بحث کی ہے۔ قرآنی تعلیمات کا وہ حصہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا وہ عمل جو ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں صحابہ (رفقائے راہ) کی تعلیم و تربیت و تنظیم میں صرف ہوا وہ خلافت باطنہ ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ قرآن جہاد کا حکم دیتا ہے۔ آج کل کے دور میں ہم جہاد کو انقلاب کہتے ہیں اور مجاہد کو انقلابی۔ تو مولانا فرماتے ہیں کہ ہم لوگوں کو قرآنی انقلاب کی طرف بلاتے ہیں کہ قرآن تقویٰ کی دعوت دیتا ہے یعنی بین الاقوامی منصفانہ حکومت دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے۔ قرآن میں ایسی تعلیم موجود ہے۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ سورۃ النحل میں شروع سے لے کر آیت ۸۹ تک بین الاقوامی عقائد پر بحث ہے اور آیت ۹۰ کے بعد بین الاقوامی قانون کے بنیادی مسائل شروع ہوتے ہیں۔ آیت ۹۰ سے ۱۰۰ تک تقویٰ کی تفسیر ہے۔ آیت ۹۰ "اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا اور قرابت داروں کو دینے کا اور منع کرتا ہے بے حیائی سے اور نامعقول کام سے اور سرکشی سے، تم کو سمجھاتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔" (آیت نمبر ۹۰ کی تفسیر شامل کی گئی ہے۔)

مولانا نے خلاصے میں یہ بھی فرمایا کہ قرآن کی صحیح تعلیم ظلم کی بالکل اجازت نہیں دیتی۔ یہ بات قرآنی تعلیمات کے عین مطابق ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو اس لیے مبعوث کیا کہ دنیا سے ظلم کو اور ظالمانہ نظام کو مٹا کر منصفانہ نظام قائم کریں۔ پہلے انبیا اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین بنا کر ساری دنیا کے لوگوں کو ظلمات (اندھیرے) سے نکال کر روشنی کی طرف لے آنے کے لیے مبعوث کیا گیا۔ سورۃ ابراہیم میں پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"یہ (قرآن) کتاب ہے جس کو ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر

نازل کیا ہے تاکہ آپؐ تمام لوگوں (ساری انسانیت) کو ان کے رب کے حکم سے اندھیروں (ظلمات) سے نکال کر روشنی کی طرف یعنی خدائے غالب اور تعریف کیے ہوئے کی راہ پر لے آئیں۔"

مولانا فرماتے ہیں کہ ظلم کی کئی اقسام ہوتی ہیں۔ایک ظلم علم میں دوسرا حکم میں، پھر اس کی کئی شاخیں ہوتی ہیں۔(اس مختصر مضمون میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے) مکی دور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی تعلیم، تربیت و تنظیم کا کام کرتے رہے۔مولانا سندھیؒ سورۃ الرعد کی پہلی آیت کے مفہوم میں فرماتے ہیں کہ "یہ لکھے ہوئے قانون کی دفعات ہیں، جو کچھ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے یعنی ضروری ہے۔لیکن اکثر لوگ نہیں مانتے (کہ یہ بات ضروری ہے) مزید تشریح میں فرماتے ہیں کہ جو کچھ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر آپؐ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، جو خلافت باطنہ کا درجہ پورا کرتا ہے وہ حق ہے یعنی ضروری ہے۔ جب تک وہ طے نہیں ہوگا تب تک حکومت پیدا نہیں ہوسکے گی۔(نوٹ: حکومت خلافت ظاہرہ ہوگی)۔

اس مضمون میں تفسیر کے جو حوالے یا اقتباسات دیے گئے ہیں وہ اس تفسیر القرآن سے ہیں جو سندھی زبان میں مولانا سندھیؒ نے مکہ مکرمہ میں مولانا محمد مدنیؒ کو پڑھائی اور املا کرائی تھی۔اس تفسیر کا قلمی نسخہ (اوریجنل) علامہ غلام مصطفٰے قاسمی چیرمین حضرت شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے پاس ہے اور وہ اس کو چھپوا رہے ہیں۔اس تفسیر کی فوٹو کاپی اس ناچیز کو مولانا عزیزاللہ جروار تلمیذ رشید مولانا سندھی نے عنایت فرمائی ہے۔اس ناچیز نے سندھی تفسیر کو اردو میں ترجمہ کرنے کا کام شروع کیا ہے۔ڈاکٹر ہالے پوتہ فرماتے ہیں کہ سندھی تفسیرالقرآن مولانا سندھی نے مولانا محمد مدنی کو مکہ مکرمہ کے قیام کے آخری عرصہ میں پڑھائی اور املا کرائی تھی۔ارض مقدس کی برکت اور قرآن پر مسلسل غور و فکر کرنے سے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کے علوم و حکمت و

معرفت کے دروازے ان پر کھول دیے تھے۔ وہ صوفی اور عارف باللہ بھی تھے اس لیے مولانا سندھی کی یہ آخری تفسیر پہلی تفاسیر سے ممتاز ہے۔ اس تفسیر میں انسانی مسائل اخلاقی، معاشی، اقتصادی مولانا نے بڑی شرح و بسط سے بیان کیے ہیں اور وقت کے حالات کے پیش نظر علاج اور حل بھی تجویز کیا ہے۔

اس تفسیر کی خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں بسم اللہ کی "ب" سے والناس کی "س" تک ربط ہے۔ مولانا سندھی کے تلمیذ رشید شیخ عبدالمجید "امجد" سندھی فرماتے ہیں کہ جب مولانا سندھی نے مولوی حسن علی وان بچھراں (میانوالی) کی وفات کا سنا تو دعائے مغفرت کے بعد فرمایا "ہندوستان میں ہم دو آدمی ہیں جنھوں نے قرآن شریف کی بسم اللہ کی "ب" سے والناس کی "س" تک ربط سے ایک ایک مسئلے کی تفسیر کی ہے۔ اس نے "الاستعانت باللہ" کو مرکوز رکھا ہے اور ہم نے "الحکم للہ" کو (بحوالہ رسالہ نصیحت سکھر، ۴۔ مئی ۱۹۹۳ء) مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا سندھی کی تفسیر القرآن اور ان کی تعلیمات اسلام کی صحیح تعبیر پیش کرتی ہیں۔ مولانا سندھی کو خراج عقیدت پیش کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے انقلابی پیغام کو ہر گھر میں پہنچایا جائے۔ اس سے مولانا کی روح بھی خوش ہو گی اور ہمارا دینی فریضہ بھی سرانجام ہو گا۔

آخر میں اس مضمون اور موقعے کی مناسبت سے ہم مولانا سندھیؒ کے تلمیذ رشید علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی، ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ اکیڈمی (حیدرآباد۔ سندھ) پاکستان کے "پیش لفظ" سے جو انھوں نے سیرۃ النبی کی کتاب "النبی الامین والقرآن المبین" جلد اول کے لیے لکھا ہے۔ اقتباس پیش کرتے ہیں:

> "قرآن حکیم میں مسلمانوں کو جو دعا مانگنے کی تلقین کی گئی ہے وہ ہے صراط مستقیم یا سیدھی راہ (راستہ)۔ صراط مستقیم پر چلنے کے سوا انسان کے لیے نجات ناممکن ہے۔ یہی راستہ ہے جس پر حضرت آدم علیہ السلام سے لے

کر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیا چلتے رہے اور اپنے اپنے امتیوں کو بھی اس پر چلنے کی تلقین کرتے رہے۔ تحقیق ایسی راہ پر چلنے سے اپنے خالق اور مالک کے حقوق بھی ادا ہوتے رہتے ہیں اور انسانوں کے حقوق بھی پورے ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ راہ تقویٰ ہی کی ہے جس کے لیے قرآن مجید شروع ہی میں تلقین کرتا ہے اور قرآن حکیم کو ان کے لیے ہدایات اور رہبری بتایا گیا ہے۔ تقویٰ میں ایک طرف توحید کا ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے اور خدا پاک کی طرف سے بھیجی ہوئی الہامی کتابوں اور سب انبیا پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے تو دوسری طرف اللہ کی مخلوق کے حقوق کی ادائیگی اور ان سے عدل و انصاف کا برتاؤ کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ صراط مستقیم کی قرآن حکیم نے واضح طریقے (نمونے) پر رہنمائی فرمائی۔ دراصل قرآن شریف ہی انسان کے لیے سیدھی راہ یا صراط مستقیم ہے۔ اس میں بتائے ہوئے احکام پر عمل کرنے سے انسان اس دنیا میں بھی اچھی زندگی بسر کرتا ہے (کامیاب رہتا ہے) اور آخرت میں بھی فلاح حاصل کرتا ہے۔ قرآن حکیم نے انسان کو کیسے ہدایت کی؟ اس نے انسان کو ایک جامع عقیدہ دیا۔ اس عقیدے کی وجہ سے قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں عمل کرنے کی بے پناہ (بے اندازہ) قوت پیدا ہوئی اور تھوڑے ہی وقت میں انھوں نے کئی سو سالہ شہنشاہیتوں کو نیست و نابود کر کے وہاں عوامی انقلاب پیدا کر دیا۔ میرے استاد حضرت مولانا سندھیؒ فرماتے تھے کہ اگر مذہب انقلابی نہیں ہوگا تو اس کی افادیت محدود ہوگی اور ایسا مذہب ناقص ہوگا۔ خالص مذہبی انسان وہ ہے جو اسلام کے عمل قربانی اور ایثار والے سبق کو ہمیشہ سامنے رکھے۔ قرآن پاک نے قیامت تک انسان کو صحیح انسان رہنے کے لیے یہی پیغام دیا ہے کہ ایک اعلیٰ اور بلند مقصد کے لیے اپنے اندر عملی قوت پیدا کریں اور اپنی ذاتی خواہشات کو نکال کر پھینک دیں۔ ہمارے واعظوں اور خطیبوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جیسے اللہ پاک کے حقوق سکھانے پر زور دیتے ہیں ویسے ہی حقوق العباد کی ادائیگی کے لیے بھی سکھاتے رہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ دین کے فقط ایک پہلو پر زور دیا جاتا ہے

اور دوسرے پہلو حقوق العباد پر کوئی بھی دھیان نہیں دیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اقتصادی اور مالی بے انصافی اور (رفاہیت بالغہ کی) حد سے زیادہ آرام پرستی کی وجہ سے معاشرے میں اعتدال نہیں رہتا۔ تبھی تو مزدور اور صنعت کار، اور کسان اور زمیندار کے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور آگے چل کر لادینی انقلاب کی راہ کھل جاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اسلام کی صحیح تعبیر پیش کی جائے۔ اس کے لیے میرے استاد حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کی تفسیر اور ان کے افکار کو پڑھنے کی اشد ضرورت ہے۔"

اس دور کے مسلمانوں میں افسوس کہ عام طور پر فقط نام کا اسلام باقی رہ گیا ہے۔ وہ نعرے تو بڑے لگاتے ہیں لیکن عمل کے میدان میں بالکل پیچھے ہیں۔ ضرورت ہے کہ قرآن پاک کے انقلابی پیغام کو ہر گھر میں پہنچایا جائے۔ (عام کیا جائے) اور ان میں دور اول کے مسلمانوں والا جذبہ پیدا کیا جائے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین اسلام کی خدمت کی توفیق دے اور دنیا میں عادلانہ نظام قائم ہو جائے۔ آمین۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

کا تصورِ وحدتِ انسانیت

پروفیسر آذر حفیظ

مولانا عبید اللہ سندھی ایک بڑے عالم دین تھے، انھوں نے اپنی تمام زندگی اسلام اور انسانیت کے کاز (cause) کے لیے وقف کر دی تھی۔ ان کی حیات و تعلیمات کا خلاصہ یہ حقیقت ہے کہ وہ زندگی جو ایمان سے خالی ہو بے معنی اور بے مقصد ہوتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں انسان کے لیے ایمان ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ تمام عمر اس اعتقاد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جدوجہد کرتا رہے۔ حصول مقصد کے لیے اسے خود سے جہاد کرنا ہوگا، اپنے خاندان والوں سے جہاد کرنا ہوگا، اپنی قوم اور معاشرے سے جہاد کرنا ہوگا اور اگر ساری دنیا غلط کار ہو تو اس کے خلاف جہاد کرنا ہوگا، کیوں کہ اس کا ایمان اس عمل کے بغیر مکمل نہیں ہوگا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ ایمان و جہاد کا یہ درس انھوں نے قرآن حکیم سے سیکھا اور جس کا مکمل اور اعلیٰ ترین نمونہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ذاتِ گرامی میں دیکھا۔ مولانا بیان کرتے ہیں کہ انگریز حاکموں کے اہل ہند پر ظلم و جبر نے ان میں بغاوت کا لاوا روشن کیا۔ جب مشرف بہ اسلام ہوئے تو شاہ اسماعیل شہید کی جدوجہد اور ایمان سے بھرپور زندگی کو مشعل راہ پایا۔ اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور برکات نے بہت سے رموز کھولے اور وہ جذبہ، جو پنجاب اور سکھوں تک محدود تھا، بڑھ کر پوری انسانیت کے لیے قلب پر محیط

ہو گیا:

دیارِ عظمتِ غم تک پہونچ گئے آخر
وہ راستے جو تری زلفِ پر شکن سے ملے

ان بزرگوں نے یہ راز بھی کھولا کہ قرآن حکیم صرف مسلمانوں ہی کی کتاب نہیں، چوں کہ اس کا فوکس اور مخاطب پوری انسانیت ہے، اس لیے یہ کتاب پوری انسانیت کی میراث ہے اور آنے والے تمام زمانوں کے لیے ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کا یہ خلوص بنی نوع انسان سے محبت اور تکمیل ایمان کی خاطر جہاد ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے اور یہی انسانیت کے لیے راہِ نجات ہے۔ مگر افسوس صد افسوس کہ مغربی ذہن مولانا کے ان افکار و خیالات کو اسلام سے تعصب کی بنا پر جنون (Fanaticism) پر مبنی خیال کرتا ہے۔ اسلام کے خلاف مغرب کا تعصب کم از کم ہزار سالہ پرانا ہے۔ اس کی وجوہات کا تجزیہ چوں کہ بہت زیادہ تفصیل چاہتا ہے، اس لیے اس بحث میں پڑنا یہاں ممکن نہیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغربی طرزِ زندگی کی بنیاد ترکِ مذہب، عقلی رویوں اور بے مہار طلب آزادی پر ہے، اس حد تک کہ اگر یہ کہا جائے کہ وہاں اللہ کے بجائے Statue of Liberty کی درپردہ پرستش ہو رہی ہے تو غلط نہ ہو گا۔ مغربی طرزِ زندگی ایسا لگتا ہے کہ اپنے نقطہء عروج کو پہنچ کر زوال پذیر ہو چکا ہے اور اب مغرب میں جو بگاڑ پیدا ہو چکا ہے عقل سے اس کی اصلاح ممکن نظر نہیں آتی۔ مغربی فلسفی، اہل علم و بصیرت، مغربی تہذیب کو بے روح لادین اور بنجر قرار دیتے ہیں۔ مشہور نوبل انعام یافتہ انگریز شاعر ایلیٹ (T.S. Eliot) کی مثال لیجیے۔ اس کی نظم "The Waste Land" کا موضوع یہی بے روح اور بنجر مغربی تہذیب ہے۔ اس کے خیال میں مغرب نے اپنے خالق سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے اور مذہب کو خیرباد کہہ کر بنجر پن کے عذاب میں مبتلا ہو گیا ہے۔

فوکالٹ (Foucault) جو کہ ایک فرانسیسی مفکر ہے اور جس کے نظریات

پر اسٹواتھ (Stuath) نے اپنے تجزیوں کی بنیاد رکھی ہے۔ کچھ اسی قسم کے خیالات کا حامل ہے۔ کچھ لوگ Foucault کو کارل مارکس کے بعد سب سے بڑا سماجی مفکر (Social Thinker) سمجھتے ہیں۔

۱۹۷۸ء کے ایرانی انقلاب کے حوالے سے لکھتا ہے کہ اس انقلاب میں اسلام ایک بے روح دنیا میں روح بن کر نمودار ہوا۔ Foucault کا یہ موقف ہے کہ مغربی نقادوں کو اسلام کے ساتھ مکالمہ کرنا چاہیے:

"اسلام کے ساتھ بحث یا مکالمے کے لیے ذہانت کا یہ تقاضہ ہے کہ ہم نفرت کو ترک کر دیں اور ہزار سالہ تعصبات سے ہاتھ اٹھالیں اور مسلمانوں کو جنونی کی حیثیت سے نہ پیش کریں۔"

علامہ اقبال کی فکر اس مسئلے میں شاید سب سے بلند ہے اور واضح بھی۔ ۱۹۳۸ء میں نوروز کے موقع پر لاہور ریڈیو سے ایک تقریر میں فرمایا:

"انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ جب تک دنیا کی تعلیمی طاقتیں اپنی توجہ کو احترام انسانیت کے درس پر مرتکز نہ کر دیں، یہ دنیا بہ دستور درندوں کی بستی بنی رہے گی۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو نسل، زبان، رنگ اور مقام سے بالاتر ہے ..... جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے "الخلق عیال اللہ" کا قائل نہیں ہو جائے گا، انسان اس دنیا میں کامرانی کی زندگی بسر نہ کر سکے گا، اور اخوت، حریت اور مساوات کے الفاظ کبھی شرمندہ معنی نہ ہوں گے۔"

آیئے اب ہم ان پہلوؤں اور عوامل پر بھی نظر ڈالیں جن کی بنا پر مولانا وحدتِ انسان کو جزوایمان سمجھتے ہیں۔

مولانا اس فکر کے حامی ہیں کہ قرآن مجید پوری انسانیت کی بنیادی فکر کا ترجمان ہے اور یہ فکر اپنی فطرت میں آفاقی ہے۔ تمام مذہبی اصولوں اور قابل قدر انسانی افکار کا خلاصہ ہے۔ آپ انھیں قوانین خداوندی (Divine Laws) کہیں، مذہب کہیں یا

ضمیر انسانی ۔ تمام پیغمبر، اہل علم و دانش اسی ضمیر انسانی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مولانا کے خیال میں قرآن حکیم اسی بنیادی اور خالص فکر انسانی یا ضمیر انسانی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسی طرح گیتا، انجیل اور توریت نے اپنے اپنے ادوار میں اسی حقیقت کی ترجمانی کی، لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ میلے ذہن اور ژولیدہ فکر لوگوں نے غلط تشریح و توضیح کے ذریعے حقیقت کو مسخ کر دیا جو کفر کی صورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کی روشنی میں مولانا پر یہ بات واضح ہوئی کہ قرآن حکیم کا اصل مدعا دراصل خالص، پاک اور بلند انسانیت کا قیام ہے۔ اس مقصد کے لیے جدوجہد کرنا انسانی زندگی کا ایک اعلیٰ ترین مقصد ہے۔

مولانا نے تاریخ کے ایک اہم عمل یعنی process کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ یہ عمل بنی نوع انسان کے لیے زہر قاتل ہے کیوں کہ یہ انسانی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ ایک قوم ایک مذہب اختیار کرتی ہے ابتدا میں یہ خالص حالت میں ہوتا ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ثقافت، روایات، زبان اور دیگر طور طریقے اور رسوم و رواج اس کی شکل تبدیل کر دیتے ہیں اور یہ ایک قومی مذہب بن جاتا ہے اور اس کی آفاقیت نظر نہیں آتی۔ پھر اس قوم کا اصرار ہوتا ہے کہ اس کا یہ قومی مذہب ہی دراصل پوری انسانیت کے لیے نمونہ ہے، باقی مذاہب درست نہیں، لیکن یہ داستان یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ قومی مذہب آگے جا کر گروہی اور فرقہ وارانہ مذہب کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اس کے بعد ذاتی مذہب کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح وحدتِ انسانیت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ انتشار اور کفر کی بے شمار صورتیں سامنے آتی ہیں۔ سب یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم درست ہیں باقی کافر ہیں۔ اس طرح لڑائی جھگڑے اور فساد عام ہو جاتے ہیں، قتل و غارت گری کے بازار گرم کیے جاتے ہیں۔ قرآن حکیم نے اس صورت حال سے لوگوں کو آگاہ کر دیا ہے، توحید کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر انسانوں کو وحدت اور شیرازہ

بندی کی طرف بلایا ہے۔

قرآن کریم تمام قومی، گروہی اور انفرادی مذاہب کی نفی کرتا ہے کیوں کہ یہ وحدتِ انسانی کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں اور انسان جو اس روے زمین پر ایک خاندان کی طرح ہے اسے منتشر اور پراگندہ کرتے ہیں۔ مولانا کے نزدیک بہترین مذہب وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب ہو۔ قربت کے معنی یہ ہیں کہ جو قومی، مذہبی، نسلی لسانی اور دیگر امتیازات سے بالاتر ہو اور انسانیت کو ایک خاندان سمجھتا ہو۔ مولانا انسان سے محبت کو مذہب کی صحیح روح کہتے ہیں اور قرآن مجید کو قوموں کی میزان مانتے ہیں۔ باقی سب رسوم و روایات میں قرآن حکیم کا مقصد انسانیت کو رسم و رواج کی غلامی سے آزادی دلانا ہے کیوں کہ قومو ں نے ان رسوم و رواج کو اصل مذہب سمجھ لیا ہے اور ان کو بنیاد بنا کر ایک قوم دوسری قوم کی ہلاکت کا سبب بنی ہوئی ہے۔ قرآن کا ماننے والا موحد ہوتا ہے، اس کا کیش ترکِ رسوم ہوتا ہے وہ انسانیت کو اصل کی طرف بلاتا ہے۔

الغرض وحدت اور اتحادِ انسانیت میں مولانا کو پختہ یقین ہے، قرآن مجید اس خیال کی شرح پیش کرتا ہے اور ایک مثالی عالمی معاشرے کی دعوت بھی دیتا ہے جو توحید اور وحدتِ انسانیت کی ایک زندہ مثال ہو۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

ایک انقلابی مفکر ۔۔۔ عظیم رہنما

مولانا سعید الرحمن علوی

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی (ولادت ۱۸۷۲ء، وفات ۱۹۴۴ء) کے متعلق ان کے ایک عقیدت کیش پروفیسر محمد سرور مرحوم کہتے ہیں:

"عدیم النظیر دل و دماغ، غیر معمولی ثبات و استقلال اور پیہم جدوجہد یہ ہے مولانا عبید اللہ سندھی کی شخصیت، سرتاپا انقلاب اور انقلاب آفریں۔"

ایک دوسرے عقیدت کیش حضرت الاستاذ مولانا صوفی عبدالحمید سواتی فرماتے ہیں:

"بایں ہمہ مولانا سندھی اپنے مسلک، عقیدے اور عمل کے لحاظ سے پکے، سچے، راسخ العقیدہ اور پرجوش مسلمان تھے، مجسم انقلاب اور نہایت ہی حساس دل رکھنے والے اولوالعزم شخصیت کے مالک تھے، توکل و قناعت کے درجہ عالیہ پر فائز تھے، ذاکر تھے، شاکر تھے۔ ان علماء ربانیین میں سے تھے جو ظاہر و باطن کے کمالات سے متصف ہوتے ہیں۔ خدا پرست تھے، فکر عالی رکھتے تھے، عالم باعمل تھے، جن کا علم عمیق، فہم دقیق اور فکر انیق تھا۔ سیاست و انقلاب کے امام تھے، مطالعہ نہایت وسیع تھا، ذہانت تو خدا تعالیٰ نے خوب ہی عطا فرمائی تھی، مشرق میں برٹش ایمپائر جن لوگوں سے شدید خائف تھا، وہ ان میں سے ایک تھے۔"

(مولانا عبید اللہ سندھی کے علوم و افکار، ۱۹۹۰ء۔ ص ۱۳۔۱۴)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ مولانا سندھی کے

ہم عصر اور استاد بھائی تھے، لیکن وہ نہ صرف مولانا سندھی بلکہ اپنے استاد حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ تعالیٰ کی سیاسی فکر اور سوچ کے بھی خلاف تھے، اس کے باوجود موتمر الانصار کے اجلاس میرٹھ ۱۳۳۰ھ کے اجلاس میں انھوں نے جو مقالہ، داعیان امت اور ہادیان ملت (دعاۃ الامتہ وہداۃ الملتہ) کے عنوان سے پڑھا، اس میں مولانا سندھی کے لیے فرمایا:

"اب میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اور اس مختصر مضمون میں صرف اجمالی خاکہ ضرورت و حالت دار العلوم کا کھینچا گیا ہے۔ اس کے بعد میں مولانا عبید اللہ صاحب ناظم جمعیت الانصار سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ زبانی یا اپنی تحریرات سابقہ یا حال کے ذریعے سے جو کہ اسی مضمون میں لکھی گئی ہوں اسی مضمون کی جس قدر مناسب سمجھیں تفصیل فرمادیں کہ وہ اس کو اچھی طرح سمجھے ہوئے ہیں اور اچھی طرح سمجھا سکتے ہیں بلکہ میں نے جو کچھ ان پریشاں عبارات میں عرض کیا ہے وہ ان ہی کی توجہ کی برکت ہے، اور میں یہ بات براہِ تکلف نہیں کہتا، بلکہ یہ ایک واقعہ ہے جو مجھ پر گزرا ہے کہ جب مجھ سے مولوی صاحب موصوف نے اس باب میں کچھ لکھنے کو فرمایا، واقعی میں خالی الذہن تھا۔ ایک صفحے کے لائق بھی ذہن میں مضمون نہ تھا اور مولوی صاحب نے فرمائش کی بیس صفحے کی۔ میں نے عذر بھی کیا، مگر ان کے دوبارہ فرمانے سے قبول کرنا پڑا۔ لیکن متردد تھا کہ کیا لکھوں گا؟ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی عبارت، کہ وہ بھی مجھ کو مولوی صاحب ہی سے ملی تھی، میرے پاس کل سرمایہ تھا، مگر جب لکھنے بیٹھا غالباً پانچ گھنٹے میں یہ بیس صفحے لکھے گئے۔ میرا اعتقاد یہی ہے کہ اس فضل خداوندی کے ظاہری دو سبب ہوئے؛

ایک مدرسہ دیوبند کی مقبولیت،

دوسرا مولوی صاحب کے توجہ کی برکت، اس کے چاہے یہ معنی نہ ہوں کہ مولوی صاحب، صاحبِ تصرف ہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ صاحبِ خلوص ہیں، خلوص کی ایسی تاثیرات متعدیہ کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔"

(ماہنامہ القاسم، دیوبند۔ بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ (اپریل ۱۹۱۲ء)، ص ۲۴)

حضرت حکیم الامت رحمتہ اللہ تعالیٰ کا تعلق مولانا سے معاصرت کا تھا اور دنیا جانتی ہے کہ معاصرت بڑا فتنہ ہے لیکن مولانا تھانوی کا یہ اقتباس اتنا واضح ہے کہ اس کی شرح کی ضرورت نہیں، اس اقتباس سے مولانا سندھی کے کمال خلوص کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ ایک مسلمان کی عظیم متاع ہے۔ یہ سبھی اقتباس مولانا کے حلقے کے لوگوں کے تھے، ایک ہم سبق و معاصر، دوسرے دو عقیدت کیش۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مودودی کے چند اقتباس بھی درج کر دیے جائیں جو ملت کے ہر داعی، مجدد اور انقلابی کے ناقد رہے۔ دور آخر کے علما اور ان کی سیاسی تحریکات کے تو مولانا مودودی سخت ناقد تھے۔ اس ضمن میں "مسلمان اور موجودہ کشمکش" کے عنوان سے ان کے مضامین کا بڑا شہرہ ہوا ان مضامین میں موصوف نے کانگریس تو در کنار جمعیت علمائے ہند تک کے اکابر تک، جو خود ان کے علمی و فکری مربیوں میں تھے، فلسفہ و فکر کے لتے لے ڈالے۔ اس کے باوجود مولانا مودودی نے سندھی جیسے مظلوم کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا:

> مولانا عبید اللہ سندھی جیسا صاحبِ فراست آدمی میں نے کم ہی دیکھا ہے، ان کے علم و فضل میں کوئی شبہ نہیں۔ ایسے وسیع النظر عالم اب کہاں؟
>
> (شخصیات، ص ۲۲۳)

> مولانا سندھی مرحوم جن کی وفات زمانہ حال کا ایک قومی سانحہ ہے، ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے مقصد اور تخیل کے پیچھے اپنا پورا سرمایہ زندگی لگا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ لوگ بھی ان کے احترام پر مجبور ہیں جو ان کے خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے۔ لیکن مولانا مرحوم اپنے خیالات کو عمل میں لانے کا جتنا زبردست جوش اور ولولہ رکھتے تھے، انھیں سمجھانے کی اتنی قدرت نہ رکھتے تھے۔ ان کا تخیل ایک شارح کا محتاج تھا جو ان کی بات سمجھ کر دوسروں کو اچھی طرح سمجھائے۔ یہی خدمت ان کے لائق شاگرد پروفیسر محمد سرور صاحب نے انجام دی۔
>
> (ایضاً، ص ۲۲۴)

> مولانا سندھی ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ عالم دین ہیں۔ انھوں نے

جو قربانیاں اپنے اصول اور اپنے مشن کی خاطر سالہا سال تک کی ہیں وہ ان کے خلوص کو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ثابت کرتی ہیں۔ لہٰذا اگر ان جیسا ایک مخلص اور جہاں دیدہ عالم ہمارے سامنے بعض اجتماعی مسائل پر اپنے کچھ نظریات، جو ظاہر ہے کہ اس کے طویل تجربات اور برسوں کے غور و فکر پر مبنی ہیں، پیش کرتا ہے، تو ہمارے لیے مناسب تر بات یہ ہے کہ اپنے ذہن کو شکوہ و شکایت یا شبہات میں الجھانے کے بجائے اس کے نظریات کو علمی حیثیت سے جانچ کر دیکھیں، اور سنجیدگی کے ساتھ ان پر تنقید کریں۔ ایک ذی علم اور فہیم آدمی جو نیک نیت بھی ہو، اس سے ہم بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ جب اس کی غلطی اس پر واضح ہو جائے گی تو وہ اس سے رجوع کر لے گا۔ اور بالفرض اگر وہ اپنی غلطی کا معترف نہ بھی ہو تب بھی اس کے غلط نظریے کو زمین میں جڑ پکڑنے سے صرف سنجیدہ علمی تنقید ہی روک سکتی ہے۔ شکوہ و شکایت اور طنز و تعریض سے اس کا سدِ باب نہیں کیا جا سکتا۔

(مسئلہ قومیت، ص ۱۰-۱۱)

مولانا مودودی نے اپنی تحریروں میں مرحوم سندھی کی فراست، وسعت نظر کا جی بھر کر اعتراف کیا اور یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ ایک ایسی شخصیت تھے جنھوں نے اپنے مقصد کے لیے پورا سرمایہ، زندگی تج دیا، نیز یہ کہ وہ ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ عالم تھے اور انتہائی مخلص .... لیکن سوال یہ ہے کے مرحوم مودودی نے سندھی کے علم و نظر، تجربہ اور اخلاص سے فائدہ کیا اٹھایا؟ مولانا مودودی سمیت بہت سے لوگوں کا المیہ یہ رہا .... اور اب تو سبھی مذہبی لوگوں کا یہ المیہ ہے کہ وہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کم ہی کرتے ہیں اور اندھی تقلید اور روایت پرستی کو ترک کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ مرحوم مولانا سندھی کے بہت سے اپنوں نے اسی لیے ان سے ناراضی کا اظہار کیا کہ وہ مردِ قلندر سچی بات کہنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ آج کے دور میں علما نے فرقوں اور مسلکوں کی بنا پر جس طرح کی سیاست بازی شروع کر رکھی ہے وہ ایک

المناک داستان ہے ..... ابنِ خلدون کے دور میں علما کے حلقوں میں اس طرح کی گروہ بندیاں نہ تھیں، اس کے باوجود فلسفہ، تاریخ کے اس امام نے جہاں تاجر طبقے کے لیے یہ کہا کہ وہ حکومت میں آکر ہر پالیسی اپنی ذات کے حوالے سے بنائیں گے وہاں علما کو سیاست کے لیے "اجنبی" قرار دیا، اس لیے کہ علما کا میدان یہ نہ تھا جس کا ہم آج تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ سیاست کے کوچہ میں خاک چھاننے کے نتیجے میں یاران طریقت نے اپنا حلیہ بگاڑ لیا اور عزتِ سادات بھی گنوائی ..... رواں صدی کے دوسرے عشرے میں جمعیت علما ہند کے نام سے علما کے جس اجتماعی پلیٹ فارم کا ہم فخر و مباہات سے ذکر کرتے ہیں، اس نے فی الواقع علما کی اجتماعیت کا سرو سامان کیا، اس جماعت کی تاسیس (۱۹۱۹ء) سے لے کر آزادی، وطن (۱۹۴۷ء) تک کی غالب دستاویزات جمع ہو کر شائع ہو گئی ہیں۔ ان دستاویزات کا ایک ایک حرف پڑھ جائیں اور ساتھ ہی ان بندگانِ بے نفس و صاحبان اخلاص کا کردار دیکھ لیں، انھوں نے سیاست گردی کے لیے اس پلیٹ فارم کو استعمال نہیں کیا، اس پلیٹ فارم کا مقصد ملت کے علمی ورثے کی حفاظت، دین اسلام کی ترویج، ملت کے اخلاقی نظم کی حفاظت اور ایسے ہی امور تھے، عملی سیاسیات کے لیے واحد ذمہ دارانہ پلیٹ فارم کانگریس کو استعمال کیا گیا۔ بعض حضرات کے بقول ان حضرات کی کانگریس سے وابستگی بطور ضمیمہ تھی۔ حالاں کہ ایسا کہنا سچائی کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ ان حضرات نے ایسا کیا تو ذمہ دارانہ اور قائدانہ انداز سے نہ کہ اپنی ہستی مٹا کر اور ضمیمہ بن کر ..... لیکن آج مسلکوں کی بنا پر جس مذہبی سیاست کا رواج پڑ گیا ہے اور ہر مسلک کے لوگ کئی کئی ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے ہیں اور اس سارے عمل نے جس شرمناک اور افسوسناک فرقہ واریت کی شکل اختیار کر لی ہے اس کا اندازہ سندھی کو شاید بہت پہلے تھا ..... آج کی اس ساری افسوسناک صورت حال کو سامنے رکھ کر مولانا کے چند اقتباسات ان کے عزیز شاگرد سرور صاحب کے حوالے سے آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں:

"ہم اس وقت جس مذہبیت کا شکار ہو رہے ہیں، یہ مذہبیت روگی ہو چکی ہے ..... اس مذہبیت کے طفیل انسان، انسان کے خون کا پیاسا ہو گیا ہے میں اس روگی مذہبیت کو مٹانا چاہتا ہوں۔"

ستم یہ ہے کہ مولانا کے بہت سے نام لیوا اس روگی مذہبیت کو سینہ سے لگائے بیٹھے ہیں اور انھوں نے مذہب کو برادر کشی کا ذریعہ بنالیا ہے۔ حالاں کہ مذہب آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھلاتا۔ مولانا سید انور شاہ کے بقول:

"چند مذاہب کے ماننے والے شرفا مدتوں اکٹھے رہ سکتے ہیں لیکن ایک مذہب کے کمینے نام لیوا اکٹھے نہیں رہ سکتے۔"

مولانا بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہمارے موجودہ مذہبی طبقے ناکارہ ہو چکے ہیں، وہ آسانی سے رجعت پسندی کا آلہ۔ کار بن جاتے ہیں۔"

یہ چند الفاظ ہماری موجودہ حالت کے بہت ہی صحیح عکاس ہیں، اس سے بڑا ناکارہ پن اور کیا ہو سکتا ہے کہ ابو الکلام کے ایک روحانی فرزند حافظ نور الحسن مرحوم کے بقول دوسروں کے چولہے کا ایندھن بننا، آج کے علما نے زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ جس قرآن و سنت کے وہ دعوے دار اور علم بردار ہیں ان کی روشنی میں زندگی انسانوں کے زندہ مسائل کا حل پیش کرنے کے بجائے ضد، ہٹ دھرمی اور تعصب کی راہ اپنانا شیوہ۔ مردانگی بن گیا ہے، ورنہ پاکستان جیسے ملک میں جس قسم کی گلی سڑی قیادت کے بعد دیگرے انسانی اقدار کا جنازہ نکال رہی ہے، اس کے پیش نظر مذہبی لوگوں کے لیے کرنے کے بہت سے ٹھوس، مفید اور مثبت کام تھے۔ پر افسوس یاروں کا کام صرف یہی رہ گیا کہ مراعات یافتہ طبقات کے ظالمانہ طور، طریقوں کو شرعی تحفظ فراہم کیا جائے۔ اسی لیے تو مولانا روگی اور ناکارہ مذہبیت کی بات کر کے اس کو مٹانے کے عزم کا اظہار کرتے۔ وہ ایسا نہ کر سکے لیکن زمانہ خود اب اسی رخ پر آگے بڑھ رہا ہے اور وہ دن دور نہیں جب یہ فرقہ واریت کے علم بردار، ناکارہ اور روگی مناسہ کردوں کوڑوں کی طرح

مسلے جائیں گے اور فما بکت علیھم السماء والارض کے مصداق ان پر کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ اسی حوالے سے مولانا کا ایک اور ارشاد۔ بہ روایت سرور صاحب مرحوم وحولقہ:

"مولانا کہتے ہیں کہ یہ گھروندے جو تم نے بنا رکھے ہیں اور انھیں تم فلک الافلاک سے بلند تر سمجھتے ہو، یہ گھروندے زمانے کے ہاتھ سے اب بچ نہیں سکتے۔ تمھارا تمدن، تمھارا سماج، تمھارے افکار، تمھاری سیاست اور تمھاری معاشرت سب کھوکھلی ہو چکی ہے۔ تم اسے اسلامی تمدن کہتے ہو، لیکن اس تمدن میں اسلام کا کہیں شائبہ بھی نہیں، تم مذہب کا نام لیتے ہو، لیکن یہ مذہب محض تمھاری ہٹ دھرمی کا نام ہے۔ مسلمان بنتے ہو تو اسلام کو سمجھو، یہ اسلام جسے تم اسلام کہتے ہوں، یہ تو کفر سے بھی بدتر ہے۔ تمھارے امیر جاہ پرست ہیں، حکمران شہوت میں پڑے ہوئے ہیں اور غریب طبقے توہمات کا شکار ہیں۔ بدلو ورنہ زمانہ تمھارا نشان تک نہ چھوڑے گا، سنبھلو ورنہ مٹا دیے جاؤ گے۔"

اقتباس وسیع تناظر میں پڑھا جانا چاہیے، اس میں پوری ملت اور ملت کا ہر طبقہ مخاطب ہے۔ اس کے حکمرانوں، امرا، علما اور عوام کی ذہنی و نفسیاتی حالت کی سچی تصویر ہے، اس بات کا ماتم ہے کہ کس طرح مذہب کا نام مفادات کی خاطر لیا جاتا اور مذہب کا استحصال ہوتا ہے۔ مولانا صاحب طویل جلاوطنی کے بعد واپس تشریف لائے تو اس وقت یہ کاروبار زوروں پر تھا۔ (جس نے جنوبی ایشیا کے کروڑوں مسلمانوں کو سیاہ بختی کے غار میں ڈھکیل کر انھیں منتشر کر دیا، اس کارِ خیر کے لیے مذہب کا نام لیا گیا کلمے کا ورد کیا گیا اور انھوں نے لوگوں کو) اسلامی نظام کی نوید سنائی جو رہ و رسم بندگی سے ناآشنا تھے۔ مولانا نے جس ہٹ دھرمی کا ذکر کیا وہ آج عفریت کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اس ہٹ دھرمی نے اب کلاشنکوف کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس کے نتیجے میں مساجد و معابد، درسگاہیں اور ہر مقام انسانیت کے خون سے لالہ زار بن گیا ہے۔

مولانا غربا کی توہم پرستی کا رونا روتے ہیں، لیکن یہاں حال یہ ہے کہ ہر بڑا چھوٹا اس آفت کا شکار ہے اور مساجد کے مقابلے میں مقابر کی رونق اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کوئی اقتدار کے حصول، کوئی اس کے تحفظ اور کوئی کسی کے اقتدار سے محرومی کے لیے زندہ اور مردہ پیروں کے پیچھے جوتیاں چٹخار رہا ہے۔ سوچیں مولانا جو کہتے ہیں کہ یہ اسلام کفر سے بدتر ہے تو غلط تو نہیں کہتے؟ جس اسلام کا طرہ امتیاز توحید خالص تھا اسی کے نام لیوا توحید خالص سے کس قدر بغاوت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ جن حضرات کا طرہ امتیاز توحید خالص اور اتباع سنت نبوی تھا وہ بھی حالات کی رو کا شکار ہو کر بہت سی بدعات، خرافات اور توہمات کا شکار ہو گئے ...... فبا حسرتا۔

مولانا المرحوم جب ان حالات کا ماتم کرتے اور لوگوں کے غلط رویے پر تنقید کرتے تو بہت سے لوگ مولانا کے متعلق عجیب و غریب باتیں کرنے لگتے ہیں، حتیٰ کہ اس بندہ اخلاص کے ایمان و عقیدہ پر طعن توڑنے سے بھی گریز نہ کرتے ... اسی قسم کے حالات کے سبب مولانا کا کہنا تھا:

"اسلام سے میری شیفتگی کا نتیجہ تھا کہ جو بھی مجھے اسلام کی بات سمجھاتا اور وہ بات میرے دل میں بیٹھ جاتی تو میں اس کا دل و جان سے گرویدہ ہو جاتا حضرت شیخ الہند نے مجھے اسلام سکھایا اور ان کے واسطے سے میں نے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو سمجھا، مجھ پر قرآن کریم کے حقائق منکشف ہوئے اور میں دین اسلام کی حکمت سے آگاہ ہوا۔ اب اگر میں موجودہ مذہبی طبقوں کے خلاف کوئی بات کہتا ہوں تو اسے یہ سمجھنا کہ میں مذہب کے خلاف ہوں، کس قدر غلط ہے میں نے دنیا کی عزیز ترین متاع یعنی اپنی والدہ کی محبت پر مذہب کو مقدم جانا اور آج عمر بھر کے مصائب اور تکالیف کے باوجود بھی مجھے اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آج جب کہ مجھے اپنی زندگی کا آخری کنارہ نظر آرہا ہے کوئی بات ایسی کہوں، جس سے خدانہ کرے اسلام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔"

ایک دنیا کو معلوم ہے کہ جس سندھی نے دیوبند کے قدیم فضلا کو اپنے استاد کے حکم سے ایک شاندار نظم (جمعیت الانصار) میں جمع کیا اور میرٹھ و مراد آباد میں عظیم الشان اجتماع کیے، اسی دیوبند سے انھیں ایک موقعے پر بوجوہ نکلنا پڑا۔ لیکن اس بات کا انھوں نے کوئی اثر قبول نہ کیا اور اپنے اسلاف کی یادگار اس عظیم جامعہ کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کا تو وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ وہ استاد محترم کے حکم سے دہلی چلے گئے، وہاں مولانا ابو الکلام، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان ہی نہیں نواب وقار الملک جیسے حضرات بھی ان کے لیے چشم براہ تھے اور مولانا کے لیے ایک نیا پلیٹ فارم تیار تھا۔ "نظارۃ المعارف القرآنیہ" کے اس اسٹیج ہی سے متعلق شبلی جیسے دیدہ ور نے بلند ترین رائے کا اظہار کیا۔ ہندوستان کے مرکزی شہر دہلی کے اس قیام کی غرض بقول خود:

> "پہلے کے بنے ہوئے اسلامی سماج کے خلاف قرآن کریم کے بنائے ہوئے اصولوں پر اسلامی سماج بنانے کی طرح ڈالی، نظارۃ المعارف دہلی کے مدرسے کی تاسیس کا مقصد اصلی یہی تھا۔"

جلد ہی مولانا کے سفر کابل کا مرحلہ پیش آگیا لیکن تھوڑے عرصے میں نظارۃ المعارف کی وجہ سے قدیم و جدید کے فضلا یا بالفاظ دیگر دیوبند اور علی گڑھ کا ملاپ ہونے کی راہ نکل آئی۔ یہی بیج تھا جس سے آئندہ چل کر جامعہ ملیہ کا پودا پھوٹا، جس کا افتتاح حضرت شیخ الہند نے شدید علالت و نقاہت کے باوصف علی گڑھ کی مسجد میں کیا اور پھر اس ادارے کو دہلی منتقل کر دیا گیا۔ اس ادارے نے ملت مسلمہ ہندیہ کے لیے ایسے نصاب و نظام تعلیم کی طرح ڈالی جس سے مسلمانوں کے مذہب، ثقافت، دینی ورثے کے تحفظ کا جہاں سامان ہوا وہاں ملکی ذمہ داریوں کے حوالے سے بھی ان کی تربیت اور ان کے شعور کے اجاگر ہونے کی سبیل پیدا ہوئی اور یہ تصور ابھر کر سامنے آیا کہ اسلام اور وطن دارض سے تعلق میں کوئی تضاد نہیں۔ اور اس قسم کے لایعنی

سوالات کی بیخ کنی ہوئی کہ تم پہلے مسلمان ہو یا ہندوستانی؟ افسوس یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے بلاوجہ کی کٹ حجتی کا مظاہرہ کر کے ہمیشہ معاملات کو الجھایا، لیکن مولانا جیسے بہت سے لوگ جنھیں اللہ تعالیٰ نے صحیح شعور بخشا تھا انھوں نے اپنے کردار، طرز عمل اور سوچ سے ایسی حماقتوں کا دروازہ بند کیا جس طرح آج ایک شخص بیک وقت مسلمان + سعودی، مسلمان + پاکستانی وغیرہ ہو سکتا ہے اسی طرح مسلمان اور ہندوستانی ہونے میں نہ کل کوئی رکاوٹ تھی، نہ آج ہے۔

روگی مذہبیت اور اس نام نہاد مذہبیت کے علمبرداروں سے چھٹکارے کی غرض سے مولانا جیسے ہر باشعور شخص کے سامنے جو راستہ تھا اور ہے، وہ ہے قرآن مجید سے ملت کا گہرا تعلق۔ خود قرآن مجید نے اس حوالے سے بڑی واضح باتیں ارشاد فرمائیں تو رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم نے اس متن کی بہت خوبصورتی سے ترجمانی و تشریح کی، ان آیات و ارشاداتِ نبوی پر گفتگو سے بات بہت لمبی ہو جائے گی اس لیے ہم محض اسی اشارے پر اکتفا کرتے ہوئے مولانا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، انھوں نے جو روشنی حاصل کی، قرآن مجید سے کی۔ مولانا ایک موقع پر فرماتے ہیں:

"جب میں نے سکھ مذہب چھوڑا اور اسلام لایا تو میں نے قرآن کو اللہ کا کلام مانا اور قرآن کے عقائد و احکام کے بارے میں جو فکر میرے ذہن میں مرتکز ہے، میں نے ہمیشہ اس فکر کو اپنا مقصود بنایا، میری ذات ہمیشہ اس فکر کے تابع رہی ہے اور دنیا کی بڑی سے بڑی کامیابی کو میں نے کبھی اس فکر کے مقابلے میں مقدم نہیں جانا۔"

(افادات و ملفوظات، ص ۱۳۴)

مولانا نے اپنی خود نوشت میں "اپنے علمی مشغلہ" اور "امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا مدرسہ" کے حوالہ سے جو لکھا، اس سے ان کی قرآن کریم سے گہری وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

میرا علمی مشغلہ

میں تقریباً ۱۲ - ۱۳ سال سے قرآن عظیم اور حجۃ اللہ البالغہ کا بہ نظرِ عمیق مطالعہ کرتا رہا۔ تفسیر قرآن عظیم میں جس قدر مقامات میرے لیے مشکل تھے، اس زمانے میں انھیں امام ولی اللہ دہلویؒ کے اصول پر بالاطمینان حل کر سکا۔ جو لوگ میری طرح امام ولی اللہ دہلویؒ کو نہیں مان سکتے، ان کو مطمئن کرنے کا دعویٰ میں نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے اپنے اصول پر قرآن عظیم میں اس زمانے میں قابل عمل تعلیم کا ایک عملی نصاب نظر آیا۔ اس میں اس تجلی ریز مقدس مقام کی تاثیر ضرور ماننا پڑتی ہے۔ میں نے امام ولی اللہ دہلویؒ کی مشہور کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ جاری رکھا۔ مثلاً بدور بازغہ، خیر کثیر، تفہیمات الہیہ، سطعات، الطاف القدس، لمحات وغیرہ۔ ان کتابوں کے لیے بطور مفتاح میں نے مولانا رفیع الدین دہلویؒ کی تکمیل الاذہان اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی عبقات اور مولانا محمد قاسمؒ کی قاسم العلوم اور تقریر دلپذیر اور آبِ حیات کو استعمال کیا۔ مجھے لوگوں کے پڑھانے کا بھی موقع ملتا رہا اور ساتھ ہی مدرسہ قرآن حکیم بھی جاری رہا، اس سے میرے نظریات بہت وسیع ہو گئے۔ للہ الحمد۔

امام ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کا مدرسہ

"اگر مجھے موقع دیا جائے کہ میں امام ولی اللہ دہلویؒ کو حکمت کا مجتہد مستقل فرض کر لوں اور امام عبدالعزیز دہلویؒ اور مولانا رفیع الدین دہلویؒ کو اس حکمت کے منتسب اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا محمد قاسمؒ کو مجتہد فی المذہب کے مرتبے پر تسلیم کر لوں تو میں اس حکمت کو ایک ایسا اسکول قائم کر سکتا ہوں جس میں:

(الف) قرآن عظیم،

(ب) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و سنت خلفاء راشدین،

(ج) تاریخ اسلام کی پوری عقلی تشریح ممکن ہو۔ اس کے بعد تمام مذاہب

عالم اور ان کی کتب مقدسہ کی تحقیق و تطبیق اس اصول پر آسان ہو جائے:
ذالک من فضل اللہ ۔ واللہ ذو الفضل العظیم ۔

(مولانا سندھی کے علوم و افکار، ص ۲۹ ۔ ۲۲۸)

قرآن کریم کے حوالے سے مولانا کا وہ خطبہ ایک یادگار ہے جو انھوں نے موجودہ دارالحکومت اسلام آباد کے جڑواں شہر راولپنڈی میں ارشاد فرمایا ۔ یہ خطبہ ۱۹۱۴ء کا ہے، گویا اس دور کا جب مولانا اپنے انتہائی اہم مشن پر بیرون ملک روانہ ہو گئے ۔ یہ خطبہ اب چند سال قبل دوبارہ اشاعت پذیر ہوا اور اس کا عنوان ہے "قرآن پاک کا مطالعہ کیسے کیا جائے"؟

۱۹۹۰ء میں اس خطبے کا جو ایڈیشن لاہور سے شائع ہوا، اس کا مقدمہ احقر نے ناشر کی خواہش پر لکھا ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریر کا ایک حصہ جو مولانا کے ارشادات سے ماخوذ ہے شامل کر دیا جائے ۔

اسلام اور قرآن سے ہمارا تعلق اپنی مذہبی و سیاسی دکان چمکانے کی غرض سے ہے اور بس اسی لیے قرآن پر ہماری نظر نہیں اور نہ اس سے حقیقی ربط ہے ۔ مولانا سندھی علی گڑھ کے اپنے تین دوستوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ سنٹرل انڈیا کے ایک مشن کالج میں بغرض حصول تعلیم چلے گئے ۔ امتحان کے قریب اسباق بند، لیکن بائیبل کا سبق جاری، یہ حضرات پرنسپل کے پاس گئے کہ یہ سبق بھی بند کر دیا جائے تاکہ صرف ایک سبق کے لیے کالج نہ آنا پڑے اور صحیح تیاری ہو سکے، لیکن پرنسپل نے کہا۔

یہ تمام عورتیں (معلمات)، تم سب طالب علم، میں اور تمام پروفیسر فقط اسی گھنٹے کی بدولت یہاں موجود ہیں، اگر یہ گھنٹہ نہ ہو تو یہ کالج بھی نہ ہو ۔ (رسالہ ہذا قدیم ایڈیشن، ص ۱۰۹)

غور فرمائیں، مشن کالج کے پیچھے کیا جذبہ ہے اور ہماری اسلامی یونیورسٹی

اسلامیہ کالج اور ایم ۔اے اسلامیات کا کیا حشر ہے؟

اس سے بڑھ کر ستم ان مدارس کا ہے جو دین کے نام پر جاری ہیں ۔ان میں سب کچھ پڑھایا جاتا ہے، نہیں پڑھایا جاتا تو قرآن ..... منطق و فلسفہ کی دو درجن کتابیں صرف و نحو کی اتنی ہی لگ بھگ کتابیں اور کیا کیا ہے جن کی تدریس پر ۸، ۱۰ برس کا عرصہ ضائع نہیں ہوتا لیکن ۹۹ فیصد مدارس میں قرآن کا لفظی ترجمہ تک نہیں پڑھایا جاتا اور قرآنی علوم پر کوئی کتاب سرے سے موجود نہیں ۔امام ولی اللہ الدھلوی کی "الفوز الکبیر" کا جس طرح جھٹکا ہوتا ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ! مولانا مرحوم دیوبند کے نصاب کو فقہ و حدیث، تفسیر و فلسفہ اور کلام کے سمجھنے کے لیے استعداد پیدا ہونے کا ذریعہ تو بتلاتے ہیں لیکن دینی علوم کی تکمیل کا نصاب سمجھنے کو بھاری غلطی قرار دیتے ہیں ۔قرآن مجید کے ساتھ جو ہمارا سلوک ہے اور جس انداز سے ہم اسے پڑھتے ہیں اور عمر عزیز کا بڑا حصہ ادھر ادھر کتابوں میں گزار دیتے ہیں، اس کا ذکر کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے مولانا فرماتے ہیں:

> "اے بے وقوفو! جو خود کو علما کا خطاب دیتے ہو، تم یونانیوں کے علوم میں مشغول ہو گئے ہو اور صرف و نحو میں پھنس گئے ہو اور تمہارا خیال یہ ہے کہ یہ حقیقی علم ہے۔"

آگے فرماتے ہیں:

> "علوم آلیہ (صرف، نحو، ادب وغیرہ) میں شغل محض آلہ ہونے کی حیثیت سے کیا جائے، نہ کہ اس لحاظ سے کہ وہ مقصود بالذات ہیں۔"

لیکن واقعہ یہی ہے کہ اصل کا پڑا ہو گیا اور فردعات نے اصل کی جگہ لے لی۔ مولانا سندھی مرحوم نے انھی باتوں کی وجہ سے اپنے ہم عصروں سے گالیاں کھائیں اور آج ہم جیسے اس کے خوشہ چیں بھی اسی لیے "بارگاہ علما" میں مردود ہیں کہ زمانہ قیامت کی چال چل رہا ہے اور ہم اس کی طرف توجہ دلانے کی گستاخی کرتے ہیں۔

مولانا سندھی فرماتے ہیں:

۱..... قرآن مجید نہایت غور و خوض سے پڑھو اور سمجھو، پوری طرح سے اس میں فکر کرو، تدبر کرو۔

۲..... جو کچھ پڑھو اس کے مطابق صحیح عمل کرو کہ تمھاری پیدائش کا مقصد عمل ہے۔"

(قرآن کا مطالعہ کیسے کریں؟ ص ۱۵، ۱۴)

مولانا کے اس خطبہ سے اخذ کر کے چند ضروری نکات مزید ملاحظہ فرما لیں:

○ قرآن مجید کی ظاہری تفسیر و تشریح میں جو کچھ مروی ہے وہ عقل کی انتہا نہیں

○ نحوی عالموں نے عربی گرامر کا جا و بے جا استعمال کر کے قرآن سمجھنے میں تشکیک پیدا کر دی۔

○ ایک بد ترین خراب حالت کا شکار قوم (بنو اسمٰعیل، قریش) پوری طرح شفایاب ہو گئی۔ ہماری حالت یہ کیوں ہے؟ یا تو ہم اسے ذریعہ، شفا نہیں سمجھتے یا غیر مناسب طریق سے استعمال کرتے ہیں؟

○ اے بیوقوفو! جو خود کو علما کا خطاب دیتے ہو تم یونانیوں کے علوم میں مشغول ہو گئے ہو اور صرف و نحو میں پھنس گئے ہو اور تمھارا خیال یہ ہے کہ یہی حقیقی علم ہے۔

○ قرآن غور سے پڑھو، تدبر کرو اور جو پڑھو اس کے مطابق عمل کرو۔

مولانا کے ۱۹۱۴ء کے خطبے کے حوالے سے جو تفصیلات قرآن عزیز کے متعلق سامنے آئیں، ان سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ ان کی روح کس طرح قرآن میں ڈوبی ہوئی تھی! مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعے پر مولانا کے چند افادات اور بھی سامنے آجائیں جن سے اندازہ ہو گا کہ مولانا کا قرآن پر کتنا گہرا اور پختہ ایمان تھا اور وہ کس طرح ہر دور کے انسانوں کے مسائل کے لیے قرآن کو بنیاد بناتے ہیں:

قرآن کا منشا مصنوعی خداؤں کا خاتمہ

"پس جس طرح خدا کا قانون (تکوینی قانون) تمام کائنات میں جاری ہے اور کوئی اس میں شریک نہیں ہے۔ ایسے ہی اس کا قانون، قرآن حکیم انسانی سوسائٹی (معاشرے) میں جاری کیا جائے اور تمام مصنوعی خداؤں کی خدائی ختم کر دی جائے اور بندگی (عبادت) صرف ایک خدا کی کی جائے، یعنی انسان جو کچھ کرے اور جو کچھ سوچے اس سب میں یہ سمجھے کہ مجھے خدا کے سامنے جواب دینا ہے، اس میں لوگوں کے دکھاوے یا کسی حاکم کے فیصلے کو کوئی دخل نہیں یہ فیصلہ ہر ایک انسان کو خود اپنے دل کے اندر کرنا ہوگا۔ جب تک انسان کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ میرا یہ کام خدا کے سامنے پیش ہوگا تو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس وقت تک وہ اس کام کو اچھا نہ سمجھے، یہ ہے خدا کی بندگی۔ اس طرح جوابدہ سمجھنے کا یہ فائدہ ہوگا کہ وہ اپنی ساری نوع کی یکساں خدمت کر سکے گا، کیوں کہ وہ اصل میں اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی اس تجلی کے حوالے کر دے گا جو انسانیت کے قلب پر پڑتی ہے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا، تو اسے نوع انسانی کی ہمدردی اور خدمت کرنی ہوگی۔ اس سورۃ میں قرآن کے انقلاب کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ ایسا انقلاب برپا کیا جائے جو کسی خاص خطے یا قوم کی ضرورتیں ہی پوری نہ کرے، بلکہ سب انسانوں کی انسانی ضرورتیں پوری کرے۔"

(دستورِ انقلاب، ص ۷۸)

اسلام کا جامع انقلاب

"دنیا میں اب تک جو انقلابات ہوئے ہیں، وہ سب کے سب جزوی انقلابات تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا انقلاب نہ تھا جو ساری انسانیت کو اپنے اندر لینے کی کوشش کرتا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری امام انقلاب ہیں جن کی دعوت کل انسانیت کے انقلاب کے لیے ہے اور آپ نے اس کا سب

سے اچھا نمونہ حجاز میں قائم کر کے دکھا دیا، جسے دنیا اب تک اسی حیثیت سے جانتی ہے اور مانتی ہے۔ آپؐ کے انقلاب میں اس وقت کی مہذب قوموں کا بڑا حصہ آگیا اور سب کو انسانیت کی خدمت کے ایک نقطے پر جمع کر کے ان کے تعلقات ان کے خالق کے ساتھ درست کر دیے، بلکہ ان کے آپس کے تعلقات بھی ٹھیک کر دیے۔ اب جب کبھی کوئی جماعت جامع کل قومی انقلاب پیدا کرنا چاہے گی اسے آپ ہی کے پیچھے چلنا ہوگا، جو جماعت اس پروگرام کے خلاف کوئی اور پروگرام لے کر اٹھے گی وہ یا تو سرے سے ناکام رہے گی یا صرف جزوی طور پر کامیاب ہوگی۔ چناں چہ فرانس، جرمنی، ترکی اور روس کے انقلابات اس اصول کی ظاہر مثالیں ہیں۔ یہ انقلاب سب انسانی ضرورتوں کو اپنے اندر نہیں لیتے، جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا کیے ہوئے انقلاب نے لیا تھا۔"

(دستورِ انقلاب، ص ۵۰ ۱۴۹)

حق رہنمائی

"قرآن حکیم نے اپنا قانون چلانے کے لیے جو جماعت یا سوسائٹی پیدا کی ہے اس کو مہاجرین اور انصار میں سے سب سے پہلے ایمان لانے والے اور نیکی میں ان کا اتباع کرنے والوں کا نام دیا ہے۔ یہ جماعت ان کے تمام امور کے انصرام و انتظام کے لیے اپنے میں سے ایک شخص کو بڑا مان کر اپنا امیر قرار دے لیتی ہے اور یہ امیر ان میں اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق انتظام کرتا ہے، لیکن انتظام کی تمام طاقت اصل میں خود اس جماعت کے پاس رہتی ہے۔ یہ وہ سیاست ہے جو قرآن حکیم نے پیدا کی ہے۔ حج کے موقع پر ہمیشہ مسلمان یہ الفاظ کہتے رہتے ہیں: الحمد و النعمة لک و الملک لا شریک لک۔ اے خدا سب تعریف اور سب نعمت تیرے لیے ہی ہے اور بادشاہی اور حکومت بھی تیرے لیے ہی ہے، تیرا اس سب میں کوئی ساجھی، شریک نہیں۔ قرآنی سیاست کے مطابق رہنمائی کا حق زیادہ تر ان لوگوں کو حاصل ہے جو قرآن سب سے

زیادہ جانتے ہیں اور سابقین اولین کی پیروی کرتے ہیں۔

(دستورِ انقلاب، ص ۵۳ - ۱۵۲)

اس مرحلے پر مولانا کی سیاسی بوجھ کے حوالے سے بھی کچھ اشارے ضروری ہیں تاکہ یاران طریقت اندازہ لگا سکیں کہ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے کس قسم کا فہم نصیب فرمایا تھا۔ اس ضمن میں جو حضرات زیادہ تفصیلات کے طالب ہوں انھیں مولانا کی ذاتی ڈائری "سرگذشت کابل" اور سب سے بڑھ کر مولانا کے انتہائی مخلص عزیز ظفر حسن ایبک مرحوم کی "آپ بیتی" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مرحوم ظفر حسن ایبک ایک ذی صلاحیت طالب علم تھے، انھیں مدتوں مولانا کی سرپرستی حاصل رہی اور انھوں نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ مرحوم آخر میں ترکی میں ہی رہ گئے۔ ان کی آپ بیتی ۱۹۷۰ء سے قبل تین حصوں میں شائع ہوئی جس کا نہایت اپ ٹو ڈیٹ ایڈیشن ۱۹۹۰ء میں لاہور سے "خاطرات" کے نام سے چھپا۔ معروف پاکستانی فاضل ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنے قیام ترکی کے دوران ظفر صاحب سے طویل ملاقاتیں کیں۔ اس کے بعد انھوں نے پاکستان کے ترکی میں سفیر الطاف اے شیخ کی تائید سے اس آپ بیتی کو از سرِ نو مرتب کر کے اشاعت کا اہتمام کیا۔ اس اشاعت کے ساتھ پاک سفارت خانہ کے پریس اتاشی شریف الحسن صاحب کا فاضلانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ اس کتاب سے اس زمانے کے کابل، روس اور ترکی کے حالات جہاں سامنے آئیں گے وہاں ان ممالک میں مولانا کی سرگرمیوں اور ہندوستان کی آزادی کے لیے ان کی کاوشوں کا بھی صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

مولانا جن دنوں کابل میں تھے، ان دنوں کابل ایشیا کا سوئٹزرلینڈ بنا ہوا تھا، یہاں ہر سلطنت کے مدبر اور سیاست داں ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ کرنے میں مصروف تھے۔ سرور صاحب کے بقول:

"مولانا نے بین الاقوامی سیاسیات کی اس کشمکش کو دیکھا اور صرف

دیکھا ہی نہیں بلکہ اس میں بطور ایک اہم فرد کے شریک رہے، آپ نے کابل
میں امیر حبیب اللہ کی حکومت کا بھی غور سے مطالعہ کیا اور استبدادی سلطنتوں
کو اندر ہی اندر جو گھن کھا رہا تھا وہ آپ کی آنکھوں نے صاف دیکھ لیا۔"

مولانا کی نگاہ کی بلندی نے جو دیکھا، اسے انھوں نے بلا کم و کاست بیان کیا اور جو نتائج اخذ کیے وہ قوم کے اہل دانش کے سامنے رکھے تاکہ وہ مستقبل کی نامرادیوں سے خود بھی بچ سکیں اور قوم کو بھی بچا سکیں۔ مولانا المرحوم ہندوستان کے حوالے سے کسی سیاسی جماعت کو تسلیم کرتے ہیں تو صرف کانگریس کو۔ انھوں نے کابل میں کانگریس کی شاخ کھولی، بیرون ہندیہ کانگریس کی پہلی شاخ تھی اور روس کا سفر بھی کانگریس کے رکن کی حیثیت سے کیا۔ مولانا کا خیال تھا اور بالکل صحیح کہ:

"سیاسی کام فقط نظریات یا علمی تجربات کے مالک ہونے سے نہیں
چلتے، اس میں کامیابی کے لیے ایک مستعد جماعت اور روپیہ کی بھی ویسی ہی
ضرورت ہوتی ہے جیسے علم و عمل کی۔"

وہ خیال کرتے تھے کہ مستعد جماعت صرف کانگریس ہے۔ مسلم لیگ کو ایک بھیڑ سے زیادہ حیثیت حاصل تھی نہ ہے، لیکن ۲۵ سالہ جلاوطنی کے بعد کانگریس جیسی محبوب جماعت کے نظام کی خرابی پر انھوں نے برملا تنقید کی اور تمام تر ذمہ داری گاندھی جی پر ڈالی۔ مولانا سندھی اور مولانا ابوالکلام جیسے مخلص، بے غرض اور بے پناہ لوگ ہی گاندھی پر تنقید کر سکتے تھے۔ سرور صاحب راوی ہیں:

"مولانا کانگریس کے شاندار ماضی کے پیش نظر اسے بہت اہمیت دیتے لیکن ۱۹۴۲ء کے بعد انھوں نے کہا کہ کانگریس سے ایک طرف مسلمان اور دوسری طرف اشتراکی رجحان رکھنے والے الگ ہوتے جا رہے ہیں، انھوں نے متنبہ کیا کہ اگر کانگریس جلد رجعت پسندی کے اثرات سے آزاد نہ ہوئی تو بدقسمتی سے ملک کو بہت برے دن دیکھنے پڑیں گے۔ وہ کانگریس کو ایک قومی، سیکولر (ہر مذہب کا نام لیوا اپنے اپنے دائرہ میں آزاد) اور سوشلسٹ (مراد عدل اجتماعی) تنظیم کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں اور

گاندھی جی نے اسے ایک طرح کا جو مذہبی رنگ دے رکھا تھا (یہی صورت حال تھی جس نے لیگی فلسفے کی راہ ہموار کی ہے۔ (دیکھیں مولانا ابو الکلام کی "ہماری آزادی") وہ اس کے سخت بر خلاف تھے۔

گاندھی جی جنھیں برادران وطن نے مہاتما کا درجہ دے رکھا تھا، ان کے رویے پر تنقید کی جرأت مولانا جیسے لوگ ہی کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود جب بعض کوتاہ فہم ان مردان احرار پر کانگریس کے ضمیمے کی پھبتی کستے ہیں تو معلوم نہیں وہ کس دیانت کا مظاہرہ کرتے ہیں؟ ان خیالات سے مولانا کی بے پناہ سیاسی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کی بصیرت کا مزید شاہکار دیکھنا ہو تو ان کے اس پروگرام پر ایک نظر ڈال لیں جو انھوں نے ہندوستان کے مستقبل کے لیے ۱۹۲۴ء میں مرتب کیا جب وہ ترکی میں مقیم تھے اور پھر اسے ہندوستان ارسال کیا۔ اس پروگرام کی اکثر کاپیاں انگریز سرکار نے ضبط کر لیں۔ ۱۸۔ مئی ۱۹۲۵ء کے زمیندار اور سیاست سے اس کا انکشاف ہوا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ علامہ اقبال مرحوم کا خطبہ۔ الہ آباد ہو یا جمعیت علما ہند کا پروگرام (دیکھیں مکتوبات مولانا سید حسین احمد مدنیؒ)، سب پر مولانا سندھی کے پروگرام کی چھاپ ہے حتیٰ کہ میں نے بانی پاکستان کے بہت سے عقیدت مندوں سے سنا کہ ان کے ۱۴ نکات سے مولانا سندھی کا پروگرام زیادہ دقیع اور ترقی پسندانہ ہے۔ انگریز بہادر نے ایک موقعے پر ہندوستان کی وحدت کو قائم رکھ کر جس انتہائی اہم اور مفید اسکیم کا نقشہ پیش کیا وہ بھی مولانا ہی کے افکار کی صدائے بازگشت تھی۔ اگر ہندوستان کے مسلم و غیر مسلم زعما مولانا کے پروگرام کو قبول کر کے عملی شکل دلوا لیتے تو فرقہ وارانہ فسادات انسانیت کی تذلیل اور آج کے جھگڑے نام کو نہ ہوتے۔ نہ ہی یہاں مخصوص طبقات کی اجارہ داری ہوتی اور نہ ہی ایشیا کا انگ انگ زخمی ہوتا۔ مولانا کے پروگرام کے حوالہ سے ظفر صاحب لکھتے ہیں

"قبلہ مولانا صاحب نے بحث و مباحثہ کے بعد ترمیم کر کے ہندوستان کی آزادی اور آزاد ہندوستان کی حکومت کے لیے جو پروگرام مرتب کیا تھا۔ اس

کے اہم مواد کا خلاصہ ذیل میں درج کرتا ہوں؛

یہ پروگرام ذیل کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے تیار کیا گیا تھا:

۱۔ ہندوستان کے لیے کامل آزادی حاصل کرنا اور آزاد ہندوستان میں ایک وفاقی (Federal) نظام حکومت قائم کرنا۔

۲۔ ہندوستان میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں اور اسلام کو محفوظ کرنا۔

۳۔ ہندوستان میں محنت کش طبقہ (یعنی کسان، مزدور اور دماغی کام کرنے والوں کی) اکثریت رکھنے والی حکومت قائم کرنا۔ زمینداری اور سرمایہ داری کو ملک سے ختم کر دینا تاکہ کمیونزم کے سبز باغ دیکھ کر لوگ دھوکا نہ کھائیں۔

۴۔ امپیریلزم (سامراج) کے توڑ کے لیے ایشیاٹک فیڈریشن بنانا۔"

(خاطرات، صفحہ ۹۶ - ۲۹۵)

...صاحب بالکل صحیح لکھتے ہیں کہ:

...اس سے کمیونسٹوں کے پروگرام کا شروع ہی میں توڑ ہو جاتا ہے، کیوں کہ کمیونسٹ صرف مزدوروں کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، جس میں زمینداروں، سوداگروں اور کارخانہ داروں کو نمائندگی کا حق نہیں ہوتا۔"

(ایضاً ص ۲۹۷)

جب اردو تحریر میں اس پروگرام کی یہاں ضبطی ہو گئی تو ۱۹۲۶ء میں بہت احتیاط کے ساتھ اس کے انگریزی ایڈیشن کو یہاں ارسال کیا گیا۔ دکھ اس بات کا ہے کہ کانگریس جیسی شاندار ماضی رکھنے والی جماعت بھی حالات کے دھارے کا شکار ہو گئی، رہ گئی مسلم لیگ تو اس سے کسی قسم کا گلہ ہی عبث ہے کہ اس کی لیڈر شپ کے پیش نظر بقول چودھری افضل حق مرحوم "ہندو سرمایہ دار کے بالمقابل مسلمان سرمایہ دار کے لیے ایک جنت کی تعمیر تھی اور بس"۔ سو تقسیم کے نتیجے میں ایسا ہو گیا اور آج یہ خطہ جہاں ایک طرف فرقہ واریت کی جہنم میں جل رہا ہے وہاں ساتھ ہی امیر، امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ فرقہ واریت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہوئی غربت ایک دن وہ طوفان لائے گی کہ کوئی بھی بچ نہ سکے گا۔ کاش کسی کی آنکھیں کھلیں

دوسری نشست

۹۔ ستمبر ۱۹۹۴ء

صدر

پروفیسر محمد اسلم صاحب

مہمان خصوصی

مولانا عزیز اللہ جروار

شاگرد حضرت امام سندھیؒ

مقالات

مولانا عبید اللہ سندھی ۔۔۔ ایک عظیم مفکر اور سیاسی رہنما — مولانا عزیز اللہ جروار

مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور اشتراکیت سے متاثر ہونے کا افسانہ — مولانا ابو عمار زاہد الراشدی

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا تصورِ قومیت — محمد فاروق قریشی (لاہور)



ڈاکٹر ابو سلمان سندھی (شاہجہان پوری)
ڈائریکٹر مولانا عبید اللہ سندھی اکیڈمی (پاکستان)، کراچی
آرگنائزر مولانا عبید اللہ سندھی نیشنل کمیٹی، پاکستان



محمد فاروق قریشی صاحب
سکریٹری مولانا عبید اللہ سندھی سیمینار کمیٹی

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

ایک عظیم مفکر اور سیاسی رہنما

مولانا عزیز اللہ جروار

سندھ کے عظیم سپوت مفکر قرآن، فلسفہ ولی اللہیٰ کے شارح، امام انقلاب عبید اللہ سندھی کے پچاس سالہ یوم وفات کے سیمینار کے موقع پر میں ان بزرگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے انتہائی محنت کر کے ملک سے بزرگ دانشوروں اور علماء کو عبید اللہیٰ فکر کے سلسلے میں علمی، فکری، مقالات پیش کرنے کی دعوت دے کر اہم موقع فراہم کیا۔ وہ ہستی جس نے اپنے مادر وطن کی آزادی اور فرنگی سامراج کو ملک سے نکالنے کے لیے بے مثال جدوجہد کی، ۲۵ سالہ جلاوطنی کے با مشقت دن گزارے، ہزارہا مصیبتیں برداشت کیں، افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہند و پاک کے دیوبندی مسلم لیگی علما و مشائخین نے مولانا کے پروگرام کے خلاف متحد ہو کر پروپیگنڈا کیا اور امام ولی اللہ دہلوی کے اسلامی انقلابی پروگرام کو غلط طور پر پیش کرنے کے ان پر الزامات عائد کیے اس میں لیگی اور مودودی مسلک کے علمائے شامل ہیں۔ افسوس ہے کہ مولانا جیسے عظیم مفکر اسلام، مسلمان ممالک کو آزادی دلانے والے بزرگ سے آنکھیں بند کرنا اور ان کے پروگرام پر غور و فکر اور عمل نہ کرنا ایک بڑا المیہ ہے۔

مولانا سندھی نے اپنے استاد شیخ الہند مولانا محمود حسن کے حکم کے مطابق افغانستان کو ہجرت کی۔ اپنے ایک شاگرد، خادم، جمعدار فتح محمد شیخ دین پوری کو ساتھ کر کے سندھ سے کچھ پیدل، کچھ ریل پر سفر کر کے کوئٹہ پہنچے۔ حالت یہ تھی کہ کرائے کے

لیے رقم ناکافی تھی لیکن اپنے کمانڈر شیخ الہند کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے خدا پر توکل کر کے نکل پڑے۔

ایک شاگرد سندھی مولانا عبد اللہ لغاری ان کے (امام سندھی) حکم کے مطابق افغانستان ساتھ چلنے کے لیے مخفی طور پر کوئٹہ پہنچے۔ دوران سفر سبی شہر میں جمعہ کے دن چندہ کر کے کوئٹہ تک سفر کرنے کا خرچ نکالا۔ شیخ عبد الرحیم کرپلانی (شاگرد امام سندھی جو آچاریہ کرپلانی سندھ کے کانگریسی لیڈر وزیر ہند کے بھائی تھے) کو امام انقلاب عبید اللہ سندھی کے خالی ہاتھ سفر افغانستان نکلنے کی خبر ہوئی تو وہ اپنی بیوی بچوں کے رضامندی کے ساتھ ان کے زیورات بیچ کر رقم لے کر امام سندھی کی خدمت میں کوئٹہ حاضر ہوئے۔ اللہ کے فضل سے اپنی حکمتِ عملی کے طور پر امام سندھی بخیر و عافیت افغانستان پہنچ گئے۔ امام عبید اللہ سندھی کے افغانستان پہنچنے کے پروگرام کو حضرت شیخ الہند نے اپنے شاگردوں کو جو افغانستان میں رہتے تھے، امام سندھی کی روانگی کی مخفی طور پر اطلاع بھیج دی تھی۔ شیخ الہند کے متعلقین امام سندھی کی آمد کے منتظر تھے۔ ان کو یہ اشارہ بتایا گیا تھا کہ عبید اللہ کی حکمتِ عملی کی جدوجہد سے افغانستان اور ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے۔ ان میں بعض حکومت افغان کے کارندے بھی شامل تھے، اس لیے اسی سفر میں مولانا کو خاص دقت محسوس نہ ہوئی۔ امام سندھی سات سال تک افغانستان میں رہے۔ انگریزوں نے امام سندھی کو افغانستان کی حکومت میں بے اثر کرنے کے لیے ایک سرہندی سندھی مجددی پیر کو جو افغان حکمرانوں کے مرشد گھرانے کے آدمی مانے جاتے تھے، افغانستان بھیج دیا۔ اس نے افغان بادشاہ اور حکام سے مل کر اپنے پورے داؤ پیچ چلائے۔ اس وجہ سے عارضی طور پر امام سندھی کو افغانستان میں نظر بند ہونا پڑا۔ لیکن افغان حکومت کی سی آئی ڈی کی مختلف رپورٹوں سے معلوم ہوا کہ مولانا سندھی انگریز دشمنی میں سچے اور پکے ہیں اور اس کی حکمت عملی سے ہندوستان اور افغانستان کو آزادی ملنی ہے۔ اس کے بعد مولانا

سے پابندی ہٹا دی گئی۔ مولانا آزاد ہوئے اور اپنا کام وہیں سے شروع کیا جہاں سے چھوڑا تھا۔ اسی عرصے میں امام سندھی کی سیاست نے یہ کام کیا کہ امیر حبیب اللہ بادشاہِ افغانستان اپنے گشتی کیمپ میں قتل کر دیے گئے۔ بہت سی سیاسی ہل چل اور تگ و دو کے بعد امان اللہ خان افغانستان کا بادشاہ بن گیا اور امام سندھی کی خصوصی پہلی ملاقات میں امان اللہ خان کی جو پہلے مولانا سے باتیں ہو چکی تھیں ان کے طرف امان اللہ خان نے اشارہ کرتے ہوئے امام سندھی کو عرض کیا کہ "من همو هستم" (میں وہی ہوں)۔ امان اللہ امام سندھی کے شاگرد ظفر حسن لاہوری ایبک کے شاگرد تھے۔ ظفر حسن اس کو امام سندھی کے حکم کے مطابق انگریزی کی تعلیم دیتے تھے۔

امام سندھی کی حکمتِ عملی کے مطابق افغان حکومت اور ہندوستان کی انگریزی حکومت میں جنگ چھڑ گئی۔ دورانِ جنگ مجبوراً انگریزوں کو حکومتِ افغانستان سے معاہدہ کرنا پڑا۔ اس معاہدے کے تحت افغانستان مکمل آزاد ہوا۔ دس سال کے بعد ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹ بنانے کا پکا وعدہ کیا۔ مرحوم امان اللہ خان بادشاہ افغانستان کے ان کی سیاسی کم علمی اور جلد بازی کی وجہ سے بعض معاملات میں مولانا سے اختلافات ہوئے، اس لیے امام سندھی کو افغانستان چھوڑنا پڑا۔ افغانستان سے روس کی حدود تک پہنچنے کے لیے مولانا کو ایک دشوار گزار راستے سے خچروں پر سفر کرنے کی تکلیف اٹھانی پڑی۔ اس سفر میں ظفر حسن، مولانا عزیز احمد اور کئی دوسرے نوجوان مولانا کے ساتھ تھے۔ خیر و عافیت سے روسی حکومت کی حدود میں داخل ہوئے روس کی کمیونسٹ حکومت نے امام سندھی کو اپنا معزز مہمان مانا اور سرحد پر ان کا سرکاری طور پر استقبال کیا گیا۔ سات مہینے امام سندھی روسی حکومت کے مہمان رہے اس وقت دین اسلام کے بڑے عالم، اسلامی علوم، فقہ، حدیث، فلسفہ، تفسیر کے ماہر اور مختلف علوم میں بہت سی کتابوں کے مصنف علامہ موسیٰ جار اللہ لینن گراڈ کے رہنے والے نے امام سندھی کی شاگردی اختیار کی۔

علامہ موسیٰ جار اللہ نے امام سندھی کی خدمت میں مکہ معظمہ میں رہ کر تفسیر قرآن پڑھی اور لکھ کر محفوظ کیا، اس کا نام الہام الرحمن رکھا۔ بعض کتب فلسفہ شاہ ولی اللہ بھی سبقاً پڑھتے رہے۔ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مکمل تفسیر ڈاکٹر ذاکر حسین (صدر ہندوستان) کو امام سندھی نے بیت الحکمت جامعہ ملیہ دہلی میں عنایت فرمائی تھی۔ ان کے نقول قلمی استاد علامہ قاسمی کے پاس موجود ہیں۔ان سے کچھ حصہ شائع ہو چکا ہے باقی زیر طبع ہے۔امام سندھی روس کے بعد ترکی تشریف لے گئے اور ان کے خادم و رفیق مولانا عزیز احمد اور ظفر حسن مرحوم بھی ساتھ رہے۔ترکی میں امام سندھی تین سال رہے۔ترکی میں مولانا نے اپنا پروگرام "آزاد ہندوستان میں مہا بھارت سرو راجیہ پارٹی کا پروگرام" کے نام سے انگریزی اور اردو میں شائع کرا کے ہندوستان بھیج دیا۔ اس میں کانگریس کے پروگرام (ہندوستان ایک ملک) کے بجائے نظام توافق (فیڈرل سسٹم) تجویز کیا۔ ہر ایک صوبے کو مستقل ملک، زبان و معاشرت کی بنیاد پر تقسیم کر کے چند محکمے مرکز کے حوالے کر دیے گئے۔امام سندھی کے منصوبے کے مطابق جس صوبے میں ایک زبان استعمال کی جائے گی اس کو ملک کہا جائے گا، اس کو صوبہ کہنا اس کے باشندوں کی توہین ہو گی۔امام سندھی ملک اور قوم کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ ہر ایسا اجتماع جو ایک زبان بولتا ہو، معاشرت میں متعارف ہو اس کو قوم کہا جائے گا۔آخر میں ایک خصوصی بات امام سندھی کی جو ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہمارے پاس موجود ہے، اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔امام سندھی فرماتے ہیں کہ ایک ملک میں بہت سے مذاہب ہوتے ہیں مگر قوم ایک ہوتی ہے۔سندھی ایک قوم ہے، جو مختلف مذاہب رکھتے تھے، برہمن، بدھ، جین وغیرہ۔انھوں نے اپنے مذہب تبدیل کیے، بعض مسلمان ہو گئے۔ مسلمان ہو کر انھوں نے مذہب تبدیل کیا، اپنا نام اسلامی رکھا، مگر قوم وہی سندھی رہی۔ جیسے پہلے سندھی تھے، اب بھی سندھی ہیں۔ان کے آبا و اجداد وغیرہ سندھی تھے، اب بھی سندھی ہیں۔ مسلمان ہو کر انھوں نے اپنی قوم نہیں بدلی، سندھی

ہونے سے انکار نہیں کیا، فقط مذہب تبدیل کیا ہے۔ ایک ملک میں مذہب ایک یا زیادہ ہو سکتے ہیں، مگر قوم ایک ہی رہے گی۔ ایک جگہ مولانا فرماتے ہیں کہ مہاجر کوئی قوم نہیں ہوتی۔ مہاجر جس ملک میں سکونت اختیار کرے گا اسی قوم میں شمار کیا جائے گا۔

میں اپنے مقالے کو ختم کرنے سے پہلے ایک بات اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں جیسا کہ کل حافظ حسین احمد صاحب نے سیمینار میں فرمایا تھا کہ امام سندھی نے اسلام کے عظیم انقلابی پروگرام کو سوشل ازم اور سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں ایک عظیم انقلاب کے طور پر پیش کیا تھا اور عالمی سطح پر اقتصادیات کی جو جنگ چل رہی ہے اس میں ہمیں حصہ لینا چاہیے۔ اس جنگ میں تب کامیاب ہوں گے جب ہم مولانا سندھی کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کریں گے۔ اس سلسلے میں میں یہ عرض کروں گا کہ مولانا سندھی نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ جب تک اسلامی دنیا کو ان کے قومی، اقتصادی اور سیاسی مسائل سے نجات دلا کر مضبوط اور مستحکم نہ کیا جائے گا، اس وقت تک ہم دنیا کی قوموں کے مدمقابل نہ بن سکیں گے۔ اسی لیے سب سے پہلے مسلمان ممالک میں موجود قومی تضادات حل کرنے کے طرف توجہ دیں اور پھر ان کی اقتصادیات سدھارنے کی طرف توجہ کریں تاکہ ان کے تضادات کو ختم کر کے ان کو مستحکم کیا جا سکے۔ اس لیے پاکستان کے استحکام اور مضبوطی کے لیے بھی جس چیز کو اساس کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان میں رہنے والی قوموں کو اپنے وسائل اور اختیارات میں آزاد و خود مختار بنا دیا جائے تاکہ قومی تضادات کا ازالہ ہو سکے۔ یہی ایک حل ہے پاکستان کے اندر قومی تضادات کو ختم کرنے کا۔ اگر حافظ حسین احمد صاحب اپنے کل کے خطاب سے دلی طور پر بھی متفق ہیں کہ امام سندھی کا پروگرام مسلمانوں کی ترقی کا واحد ذریعہ ہے تو پھر سینٹ میں بل پیش کریں کہ پاکستان کے اندر رہنے والی سب قوموں کے اختیارات ان کے حوالے کر دیے جائیں۔ سوائے امور خارجہ، دفاع

اور بیرونی تجارت کے۔

آپ بزرگوں سے بصد احترام گذارش کرتا ہوں، خصوصاً علماے مسلک دیوبندی سے کہ امام سندھی کے علوم کا مطالعہ کریں اور ان کے سیاسی پروگرام کے مطابق بذریعہ ووٹ حکومت پر غالب آکر امام سندھی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنائیں جمعیتِ طلباے اسلام کے نوجوانوں کو امام سندھی کے علوم و افکار اور سیاست پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

والسلام علیکم

عزیز اللہ جروار شہداد کوٹی

عزیز آباد۔ براہ پنو عاقل

ضلع سکھر (سندھ)

مولانا عبیداللہ سندھیؒ

اور اشتراکیت سے متاثر ہونے کا افسانہ!

ابو عمار زاہد الراشدی

یہ المیہ کم و بیش ہر بڑی شخصیت کے ساتھ پیش آتا ہے کہ اس کی تصویر کے لیے اس کے معتقدین اور ناقدین اپنے اپنے ذوق کے مطابق الگ الگ فریم اور خاکے طے کر لیتے ہیں اور پھر تصویر کو ان میں فٹ کرنے کی متضاد کوششیں بسا اوقات اصل چہرے کو دھندلا کر رکھ دیتی ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ بھی نادان دوستوں اور بے رحم ناقدوں کے اس طرز عمل سے محفوظ نہیں رہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس منفرد انقلابی مفکر کی وفات کو نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی ہم اس کے فکر کو لے کر آگے بڑھنے کے بجائے تاریخ کے صفحات میں اسے تلاش اور دریافت کرنے کے مرحلے میں ہی رکے ہوئے ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کون تھے؟ برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کی تاریخ میں ان کی جدوجہد اور کردار کی حیثیت کیا ہے؟ اور کیا وہ اپنے فکر و فلسفہ میں مغربی سرمایہ داری اور اشتراکیت کی عالمی کشمکش سے متاثر ہو کر فریق بن گئے تھے؟ ان سوالات کا جائزہ لینے سے قبل یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان کی جدوجہد اور تگ و تاز کن مقاصد کے لیے تھی اور انھیں اپنی محنت کے لیے جو ماحول اور میدان ملا، اس میں وہ کن مشکلات اور رکاوٹوں سے دوچار ہوئے۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا ذاتی تعارف صرف اس قدر ہے کہ وہ ایک غیر مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے، اسکول کی تعلیم کے دور میں دوستوں کی سوسائٹی اور بعض

کتابوں کے مطالعے سے اسلام سے متاثر ہوئے، اسلام قبول کیا، گھر بار چھوڑا اور ان کی قسمت یاوری کرتے ہوئے انھیں اپنے وقت کے عارف باللہ سید العارفین حضرت محمد صدیقؒ (بھرچونڈی شریف، سندھ) کی خدمت میں لے گئی، جہاں ان کے دل و دماغ اور شخصیت و کردار کو ایک ایسا سانچہ میسر آگیا جس میں ڈھل کر وہ اسلام کے غلبہ و نفاذ اور ملت اسلامیہ کی عظمت رفتہ کی بحالی کی اس تحریک میں ایک کارآمد پرزے کی طرح فٹ ہوگئے، جسے تحریک ولی اللہٰی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کے بعد مولانا سندھیؒ کا تعارف تحریک ولی اللہٰی کے ایک بے لوث کارکن اور باشعور راہ نما کا تعارف ہے اور یہی وہ پس منظر ہے جو مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی اصل شخصیت سے ہمیں متعارف کراتا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے شاگرد اور دست راست تھے، جو اپنے دور میں تحریک ولی اللہٰی کے قائد اور جنگ آزادی کے سرخیل رہے ہیں۔ انہی کی وساطت سے مولانا سندھیؒ امام ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ، جدوجہد اور تحریک سے متعارف ہوئے اور پھر اسی کے لیے وقف ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے تحریک ولی اللہٰی کے لیے فکری اور نظریاتی کام بھی کیا اور معروضی حالات میں اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے جاں گسل محنت بھی کی، بلکہ اگر قربانیوں، محنت و مشقت اور ایثار کے حوالہ سے دیکھا جائے تو شاید ہی اس دور کا کوئی اور راہ نما ان کا ہم پلّہ ثابت ہو سکے۔

حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا سندھیؒ کی جدوجہد کے مقاصد اور اہداف کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس فکری اور نظریاتی جنگ کے تاریخی تسلسل پر ایک نظر ڈال لی جائے جو مسلم معاشرہ کو بیرونی فلسفوں اور معاشرتوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے طویل عرصے سے لڑی جارہی ہے۔ اس جنگ کا پہلا دور وہ تھا جب یونانی فلسفے نے اسلامی عقائد پر یلغار کی اور مسلمانوں کے اعتقادی حصار کو توڑنا

چاہا، مگر غزالیؒ، ابن رشدؒ اور ابن تیمیہؒ جیسی عبقری شخصیتیں سامنے آئیں اور یونانی فلسفہ ہی کی زبان اختیار کر کے اسی کے ہتھیاروں سے اس کا راستہ روک دیا۔ دوسرے دور میں ہندو تہذیب و فلسفہ نے مسلم معاشرے کو اپنے اندر ضم کر لینے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے، مگر حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے رفقا کی صبر آزما جدوجہد نے ہندو فلسفہ و معاشرت کی قوت ہاضمہ کو ناکارہ بنا دیا۔ اور اس جنگ کا تیسرا مرحلہ یورپی فلسفہ و معاشرت کی یلغار کا ہے جب حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قبل از وقت محسوس کر لیا اور اس کا سامنا کرنے کے لیے ایک ایسی فکری اور علمی جدوجہد کی بنیاد رکھ دی جو آج تک اس معرکے میں مسلمانوں کے لیے ڈھال بنی ہوئی ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ جب حضرت شیخ الہندؒ کے معاون و مددگار کے طور پر اس تحریک میں شامل ہوئے تو یہ تحریک اس مرحلے میں تھی کہ برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش پوری طرح انگریزی عملداری میں آ چکا تھا، اس کے خلاف جہاد بالاکوٹ، بنگال کی فرائضی تحریک اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سمیت تمام مزاحمتی تحریکیں وقتی طور پر ناکامی سے دوچار ہو چکی تھیں۔ مسلمانوں کی سیاست، تعلیم، معاشرت اور معیشت کے صدیوں سے چلے آنے والے ڈھانچے دہلی کے انگریز حکمرانوں کے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ چکے تھے اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کارکنوں کی نئی کھیپ تیار کر کے بدیشی غاصبوں کے خلاف ایک نیا معرکہ برپا کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

گزشتہ تین چار صدیوں کے دوران میں جب یورپی اقوام نے دنیا بھر کو غلام بنانے کے لیے چاروں طرف یلغار کی ہے تو یہ تنہا انگریزوں کی یلغار نہ تھی، بلکہ اس میں فرانسیسی، ولندیزی، پرتگیزی اور جرمن بھی شامل تھے، لیکن انگریز کی شاطرانہ چالوں کے سامنے ان میں سے کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکا اور بالآخر یہ سب یکے بعد دیگرے سپر انداز ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ اس سلسلے کا آخری سیمی فائنل بھی انگریزوں نے جیت لیا جو کمیونزم کے خلاف "کولڈ وار" کے نام پر چند سال قبل تک برپا رہا، اور اب تمام

مغربی اقوام امریکہ کی قیادت میں متحد ہو کر مسلمانوں کے ساتھ فائنل میچ کے لیے
پوری طرح فارم میں ہیں ۔ مگر جب شیخ الہندؒ نے اس صدی کے آغاز میں دہلی کے انگریز
حکمرانوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا پروگرام بنایا تھا تو دنیا کا سیاسی منظر آج سے بہت
مختلف تھا ۔ ترکی کی خلافت عثمانیہ جو پانچ صدیوں تک مسلمانان عالم کی سیاسی وحدت
و مرکزیت کی علامت سمجھی جاتی رہی ہے ، ابھی زندہ تھی اور جرمن ایک توانا و طاقت ور
حریف کے طور پر انگریز قوم کا سامنا کر رہے تھے ، بلکہ انگریز دشمنی نے ترکوں اور
جرمنوں کو ایک دوسرے کے قدرتی حلیف کی حیثیت دے رکھی تھی ۔ ایسے حالات میں
حضرت شیخ الہندؒ نے بھی ایک ہوشیار جرنیل کی طرح انگریزوں اور جرمنوں کی باہمی
کشمکش سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اس کے لیے منصوبہ بندی کی ، جس کی تفصیلات مولانا
سید محمد میاںؒ نے اپنی کتاب "تحریک شیخ الہندؒ" میں انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ
سرکاری دستاویزات کے حوالے سے مرتب کر دی ہیں اور اب جرمن وزارت خارجہ کے
ایک سابق ڈپٹی سیکرٹری اور برلن یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کے استاد پروفیسر اولف
شمل کے حوالہ سے بھی منظر عام پر آئی ہیں اور روزنامہ جنگ لندن ۱۶ ۔ اگست ۹۴ء کے
مطابق پروفیسر اولف شمل کے بقول شیخ الہندؒ کی تحریک پر جرمن ، ترک اور افغان
حکومتیں ان کے ساتھ ایک ایسے معاہدہ پر متفق ہو گئی تھیں جس کا مقصد برصغیر میں
انگریزی اقتدار کے خاتمے کے لیے مشترکہ کارروائی کرنا تھا ۔ یہ جدوجہد جسے عام طور پر
تحریک ریشمی رومال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور تحریک شیخ الہندؒ کے نام سے بھی
متعارف ہے ، جبکہ پروفیسر اولف شمل نے اسے "برلن پلان" کا نام دیا ہے ، مولانا عبید
اللہ سندھیؒ اس کے روح رواں تھے اور جرمنوں ، ترکوں اور افغانوں کے ساتھ
مذاکرات و معاہدات میں ان کے کردار کو کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے ، لیکن یہ
تحریک بوجوہ ناکام ہو گئی اور اسی دور میں عالمی سیاسی منظر بھی تبدیل ہو گیا ۔ ترکی کی
خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا ، جنگ عظیم اول میں جرمن شکست کھا گئے اور کیمونسٹ

انقلاب کے بعد روس ایک نئے حریف کے طور پر انگریزوں کے سامنے آگیا۔ ان حالات میں جب کہ شیخ الہندؒ کے پلان کی ناکامی کے بعد اس تحریک کے کم و بیش سب ارکان دہلی کی انگریزی حکومت کو عتاب کا شکار ہو کر جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے جا چکے تھے اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ تنہا جیل سے باہر رہ گئے تھے اور ایک موقع شناس اور مدبر سیاست دان کی حیثیت سے مولانا سندھیؒ کے لیے فطری راستہ یہی تھا کہ وہ انگریزوں کے نئے عالمی حریف "کیمونسٹ روس" کے ساتھ سلسلہ جنبانی کرتے اور جس طرح ان کے استاد حضرت شیخ الہندؒ نے انگریزوں اور جرمنوں کی کشمکش سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی، بالکل اسی طرح وہ انگریزوں اور روسیوں کی کشمکش سے فائدہ اٹھانے کی راہ نکالتے چناں چہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ماسکو کا سفر کیا، وہاں کچھ عرصہ قیام کیا، کیمونسٹ لیڈروں سے ملاقاتیں کیں، کیمونسٹ انقلاب کا مطالعہ کیا اور مغربی سرمایہ داری اور کیمونزم کی کشمکش کے پس منظر میں روسی انقلاب کے بعض پہلوؤں پر کلمہ خیر بھی کہا۔ بس یہ ہے وہ پس منظر جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یار دوستوں نے مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے اشتراکیت سے متاثر ہونے کا مفروضہ قائم کر لیا اور اب تک آنکھیں بند کر کے اس لکیر کو پیٹے جا رہے ہیں۔ بد قسمتی سے مولانا سندھیؒ کے بعض خوشہ چین، جنھوں نے اپنے استاد کی پیروی میں کیمونسٹ انقلاب اور نظام کے مطالعہ کی زحمت تو اٹھالی، لیکن ان کی طرح فکری و نظریاتی توازن قائم نہ رکھ سکے، خود پر "لغزش پا" کا الزام زیادہ بوجھل سمجھتے ہوئے انھوں نے اپنے استاد کی طرف منتقل کر دینے میں عافیت محسوس کی اور یہ بات ناقدین کے بے رحم ہاتھوں میں پہنچ کر ایک نئے فکری معرکے کا عنوان بن گئی۔ ستم بالائے ستم کہ نادان دوستوں اور بے رحم ناقدوں میں سے کسی نے بھی خود مولانا عبید اللہ سندھیؒ سے ان کا موقف اور پوزیشن سمجھنے کی زحمت گوارا نہ کی جو اپنی جلاوطنی کے اختتام پر ہندوستان واپسی سے چند ماہ قبل اپنی خود نوشت میں یہ تحریر فرما رہے ہیں کہ:

" ۱۹۲۳ء میں ترکی جانا ہوا، (اس سے پہلے) سات مہینے ماسکو میں رہا، سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چوں کہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا، اس لیے سوویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا اور مطالعے کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ (یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا، کامریڈ لینن اس وقت ایسا بیمار تھا کہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا) میرے اس مطالعے کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہؒ کے فلسفے کی ایک شاخ ہے، اس زمانے کے لادینی حملے سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا۔"

(بحوالہ "میری زندگی" از مولانا سندھیؒ ص ۱۲،
مطبوعہ مجلس قاسم المعارف دیوبند)

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی اس "نص صریح" کے بعد اگر کوئی صاحب ماسکو میں مولانا کے قیام، سوشل ازم کے مطالعے اور برصغیر کی آزادی کے لیے روسی راہ نماؤں کا تعاون حاصل کرنے کی کوششوں کو "اشتراکیت سے متاثر ہونے" کا عنوان دینے پر مصر ہیں تو انھیں رائے قائم کرنے کے حق سے نہیں روکا جا سکتا، لیکن مولانا سندھیؒ کا دامن اس الزام سے بہر حال پاک ہے۔

مولانا سندھیؒ پر اشتراکیت سے متاثر ہونے کے الزام کا ایک اور انداز سے بھی جائزہ لے لیا جائے تو بہتر ہو گا۔ وہ یہ کہ کمیونزم اور کمیونسٹ انقلاب کے تین الگ الگ پہلو ہیں، جنھیں سامنے رکھنا ضروری ہے:

○ کمیونزم کا اعتقادی پہلو جس کا تعلق خدا تعالیٰ کے انکار، مذہب سے نفرت اور اخلاقیات سے انحراف سے ہے۔

○ مغربی سرمایہ داری اور کمیونزم کے معاشی اصولوں کے تقابلی مطالعے میں ترجیحات کا تعین اور۔

○ روسی انقلاب کے ابتدائی دور میں دنیا بھر کی تحریکات آزادی کے ساتھ اس کا

ہمدردانہ طرز عمل۔

جہاں تک اعتقادات و نظریات کا تعلق ہے، مولانا سندھیؒ کا بڑے سے بڑا مخالف بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کے ایمان و کردار اور عبادات و اخلاق میں آخر وقت تک کوئی ایسا جھول سامنے آیا ہو جسے کمزوری تو کجا رخصت کے دائرہ میں بھی شامل کیا جاسکے۔ ان کا ایمان و عمل تو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی طرح عزیمت و استقامت کا ایمان و عمل ہے، جس کے ساتھ سوائے رشک کے اور کوئی نسبت قائم نہیں کی جاسکتی اور مولانا سندھیؒ خود اپنے ایمانی عزم کا اظہار ان الفاظ میں کر رہے ہیں کہ:

(۱) "ہم پر قطعی طور پر لازم ہے کہ تمام اقوام عالم کے سامنے ثابت کر دیں کہ انسانیت کے ہاتھ میں قرآن کریم سے زیادہ درست اور صحیح کوئی پروگرام نہیں ہے۔ پھر ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ جو لوگ قرآن کریم پر ایمان لا چکے ہیں، ان کی جماعت کو منظم کیا جائے، خواہ وہ کسی قوم یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہم ان کی کسی اور حیثیت کی طرف نہ دیکھیں، بجز قرآن کریم پر ایمان لانے کے پس ایسی جماعت ہی مخالفین پر غالب آئے گی، لیکن ان کا غلبہ انتقامی شکل میں نہیں ہوگا بلکہ ہدایت اور ارشاد کے طریق پر ہوگا جیسا کہ والد اپنی اولاد پر غالب ہوتا ہے۔ اب اس نظام کے خلاف جو بھی اٹھ کھڑا ہوگا، وہ فنا کر دینے کے قابل ہوگا۔"

(الہام الرحمن، بحوالہ "مولانا سندھیؒ کے علوم و افکار"
مولانا عبد الحمید سواتی ص ۱۷)

(۲) "میرا یہ غیر متزلزل یقین اور عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل بڑا روشن اور شاندار ہے۔ بے شک اسلام پوری قوت اور توانائی کے ساتھ ایک بار پھر ابھرے گا۔ لیکن خارج میں اس کا ڈھانچہ وہ نہیں رہے گا جو اس وقت ہے۔"

(ذاتی ڈائری، ص ۳۳)

(۳) "میں مطمئن ہوں کہ اسلام کا احیاء نشاۃ ثانیہ میں دو اصولوں پر ہوگا:

۱۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے اور جو آدمی ہماری اس بات پر متفق ہے وہ ہماری جماعت کا فرد ہو گا۔ یہی ایک کلمہ تمام امور کے لیے کفایت کرنے والا ہے۔

۲۔ سود کی قطعی حرمت اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس کو روکنا اور سود کھانے والوں کے خلاف اعلان جنگ کرنا۔ مسلمان ان دونوں اصولوں پر عمل پیرا ہوئے بغیر کسی طرح زندہ نہیں رہ سکتے۔"

(بحوالہ مولانا سندھیؒ کے علوم و افکار، ص ۲۴)

البتہ مولانا سندھیؒ نے مغربی سرمایہ داری اور کمیونزم کے تقابلی مطالعے میں اپنی ترجیحات ضرور قائم کی ہیں جو ان امور پر اجتہادی نظر رکھنے والے ہر صاحب علم کا حق ہے۔ اس حوالہ سے مولانا سندھیؒ کے افکار اور ترجیحات سے اختلاف یا اتفاق دونوں کی گنجائش موجود ہے، لیکن ایسے معاملات میں جن کا تعلق قرآن و سنت کی صریح نصوص سے نہیں ہے، انھیں رائے قائم کرنے اور ترجیحات متعین کرنے کے علمی حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح مولانا سندھیؒ نے روسی انقلاب کے ابتدائی دور میں دنیا بھر کی تحریکات آزادی کے ساتھ اس کے ہمدردانہ رویے کی تعریف کی ہے اور ہندوستان کی آزادی کے لیے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ یہ ایک فطری اور معقول طرز عمل ہے جو ان جیسے حالات سے دوچار کسی بھی مجاہد آزادی کے لیے ناگزیر تھا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ روسی انقلاب کے بارے میں مولانا سندھیؒ کے اس دور کے تاثرات کا اطلاق بعد کے ادوار پر بھی ہو، جب کہ روس خود ایک استعمار کا روپ دھار چکا تھا اور مشرقی یورپ اور وسطی ایشیا کی اقوام کی آزادی غصب کرکے ان کے مذہب، ثقافت اور معاشرت کو ملیامیٹ کرنے کے درپے تھا۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں رومیوں اور ایرانیوں کی باہمی جنگ کے حوالے سے قرآن کریم نے بھی ایک موقع پر رومیوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہے اور رومیوں کی

کامیابی کو مسلمانوں کے لیے باعث فرحت قرار دیا ہے، لیکن یہ ایک وقتی بات تھی اور اس وقت کے معروضی حالات کے پس منظر میں تھی۔ اس کے چند سال بعد خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام کا لشکر جرار لے کر تبوک کے مقام پر جہاد کے لیے رومی لشکر کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی طرح مولانا سندھیؒ نے اس دور میں روسی انقلاب کے بارے میں اگر کچھ تعریفی باتیں کی ہیں تو انھیں اس دور کے معروضی حالات کے پس منظر میں ہی دیکھنا ہوگا، ورنہ جہاں تک کمیونزم کے اعتقادی اور نظریاتی پہلوؤں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا نظریہ اور عقیدہ بھی وہی ہے جو اس دور کے دوسرے اہل علم کا ہے اور وہ اس سے متاثر یا مرعوب ہونے کے بجائے پوری قوت سے اس کا ابطال کر رہے ہیں اور اس کے مقابلے میں اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، اور ہم اس سلسلے میں اپنی معروضات کا اختتام مولانا سندھیؒ کے اس ارشاد پر کر رہے ہیں۔ جس کے بعد اس سلسلے میں کسی وضاحت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ مولانا فرماتے ہیں:

"جو امت قرآن کریم کا پروگرام نہیں اپنائے گی، وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگی۔ مسلمان قرآن کی عالمی تنظیمی دعوت کا پروگرام لے کر اٹھے اور پھر وہ اپنی اس تنظیمی دعوت میں کامیاب ہو گئے اور یہ صرف پچاس سال کی مدت یعنی واقعہ صفین کی تحکیم تک ہوا۔ اب جب کوئی امت اپنی تنظیمی دعوت لے کر اٹھے گی تو وہ کبھی بھی کامیاب نہ ہوگی، جب تک وہ قرآن کے پروگرام کو نہ اپنائے۔ ہم نے یہ بات تحقیق سے دریافت کی ہے اور موجودہ دور میں عالمی تحریکات کا مطالعہ کرنے کے بعد، ہمارا ایمان اس بات پر پختہ ہو گیا ہے۔ لوگ بالعموم یہ جانتے ہیں کہ روسی انقلاب فقط ایک اقتصادی انقلاب ہے، ادیان اور حیات اخروی سے بحث نہیں کرتا اور ہم ان روسیوں کے پاس بیٹھے ہیں اور ان کے افکار و خیالات، ہم نے معلوم کیے اور ہم نے بتدریج اور آہستہ آہستہ نرمی اور لطافت سے امام ولی اللہؒ کا پروگرام جو انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں

پیش کیا، ان روسیوں کے سامنے رکھا، تو انھوں نے اسے نہایت ہی مستحسن خیال کیا اور ہم سے پوچھنے لگے کہ کیا کوئی جماعت اس وقت ایسی ہے جو اس پروگرام پر عمل کرتی ہو؟ جب ہم نے نفی میں جواب دیا تو انھوں نے بہت افسوس کیا اور کہنے لگے، اگر کوئی جماعت اس پروگرام پر عمل کرنے والی ہوتی تو ہم ان کے ساتھ شریک ہو جاتے اور ہم بھی ان میں داخل ہو کر ان کا مذہب اختیار کر لیتے اور یہ بات ہمارے لیے آسان بنا دیتی ہماری ان مشکلات کو جنھوں نے ہمارے پروگرام کو کسانوں میں نافذ ہونے سے روک رکھا ہے۔ یہ ان روسیوں کی بات کا بلا کم و کاست اور بلا تحریف کے خلاصہ ہے۔ اس کے بعد مجھے یقین ہوا کہ یہ لوگ ہمارے قرآنی پروگرام کو قبول کرنے کی طرف مجبور ہوں گے، اگرچہ ایک زمانے کے بعد ہی کیوں نہ ہوں۔ ہم آج کے دور میں عالمی تحریکوں میں سے کسی تحریک کو ایسا نہیں پاتے کہ وہ قرآنی تعلیمات کے خلاف اور مناقض ہو، جس طرح انقلابی روس کی تحریک قرآنی پروگرام کے مناقض اور مخالف ہے اور باوجود اس کے کہ وہ بھی مجبور اور مضطر ہیں کہ قرآن اور اس کے پروگرام کی طرف رجوع کریں، باقی تحریکات کا کیا پوچھنا؟ اور اس چیز نے میرے ایمان میں زیادتی اور قوت پیدا کر دی ہے کہ ہدایت اور فلاح قرآن کے نزول کے بعد صرف قرآن کریم کے اتباع پر ہی موقوف ہے۔"

(الہام الرحمن، بحوالہ مولانا سندھیؒ کے علوم و افکار ص ۱۹)

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

کا تصورِ قومیت

محمد فاروق قریشی (لاہور)

جہاں تک تصور قومیت کا تعلق ہے تو ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے کئی برس بعد تک یہ کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ سرزمین ہندوستان پر بسنے والے تمام باشندے ہندوستانی قوم تھے۔یہی وجہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے معرکے میں سب ہندوستانیوں نے بلالحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل، علاقہ وزبان حصہ لیا تھا تاکہ ہندوستان کو بیرونی جارحیت سے محفوظ بنایا جاسکے اور بہادر شاہ ظفر کی حکمرانی برقرار رہے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد ۱۸۷۱ء تک تیرہ برسوں میں برطانوی حکومت کا تختہ چار مرتبہ الٹنے کی کوششیں ہوئیں تب بھی اس کے پس پردہ ہندوستانی قومیت کا تصور اور جذبہ کارفرما تھا۔ سید احمد خاں جنھیں دو قومی نظریے کا خالق، موجد اور جد امجد بنا کر پیش کیا جاتا ہے، ایک متحدہ ہندوستانی قوم کے زبردست پرچارک تھے بلکہ وہ اس نظریے میں مبالغہ کی حد تک چلے گئے کہ سرزمین ہندوستان پر بسنے والے سب ہندو ہیں۔ لیکن جب ۱۸۸۵ء میں کانگریس تشکیل پائی اور حقوق ومطالبات کے دور کا آغاز ہوا تو سید احمد کو کانگریس کی یہ ادا پسند نہ آئی۔ دراصل وہ ایجی ٹیشن کی سیاست کے حق میں نہ تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ اہل وطن حکومت برطانیہ سے بطور استحقاق کوئی رعایت طلب کریں اگر حکومت برطانیہ ازرہ عنایت خسروانہ خیرات وانعام کے طور پر کچھ عطا کردے تو اسے شکریے کے ساتھ قبول کرلیا جائے۔ انھوں نے کانگریس پر ہندوؤں کی جماعت ہونے کا

جو الزام لگایا تھا اور مسلمانوں کو اس میں شامل ہونے سے منع کیا تھا تو یہ مسلمانوں کے ذہنی استحصال کی بھونڈی کوشش تھی کیوں کہ کانگریس کے مقابلے پر جب انھوں نے خود پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی تو اس میں بنارس کے ہندو راجہ شیو پرشاد بھی شامل تھے۔

سید احمد نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایم۔اے۔او کالج کے بارے میں فرماتے ہیں:

"جب کہ میں نے علی گڑھ میں کالج کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کیا اور اس کو ایک ایسی وسیع تعلیم گاہ بنانا تجویز کیا جس میں کافی تعداد میں ہماری قوم یعنی ملک کے باشندوں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی گنجائش ہو اور دونوں گروہ عمدہ طور پر وہاں تعلیم اور تربیت حاصل کر سکیں۔" (سفرنامہ پنجاب ۲۵۵)

ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ مسلمانوں کے لیے مخصوص نہ تھا۔یہاں ہندو نوجوانوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے کی آزادی تھی، ان پر پابندیاں نہ تھیں، ہندوؤں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے سید احمد نے کالج کے حدود میں گاے کا ذبیحہ ممنوع قرار دے دیا تھا۔۱۸۷۷ء میں انتظامی کمیٹی کے گیارہ ارکان میں سے تین ہندو تھے۔۱۸۹۴ء میں سات ہندوستانی استادوں میں سے دو ہندو تھے۔کالج کے ابتدائی دور میں کئی سال ایسے بھی آئے جب کہ ہندو طالب علموں کی تعداد مسلمان طلبہ سے زیادہ تھی۔سید احمد نے کہا تھا:

"ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے طالب علم وظائف حاصل کرنے کے یکساں حق دار ہیں۔"

علامہ اقبال جن کے بارے میں عام دعویٰ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے لیے علاحدہ وطن کے قیام کا تصور پیش کیا اور بنیاد یہ رکھی کہ مسلمان ہندوستان کے دیگر مذہبی تشخصوں سے جدا ہیں اس لیے ان کے مذہبی رسم و رواج، تہذیب و تمدن اور

ثقافت کے تحفظ کے لیے الگ خطہ، زمین ہونا چاہیے۔ لیکن کسی زمانے میں وہ متحدہ ہندوستانی قومیت اور نیشنل ازم کے زبردست علم بردار تھے۔ ہندوستانی نیشنل ازم کے جذبے کے تحت انھوں نے ترانہ، ہندی "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" لکھا، جسے ہندوستان کا الیکٹرانک میڈیا آج بھی اپنے قومی ترانے کے طور پر بڑے فخر کے ساتھ نشر کرتا ہے۔ وہ ہندوستانی قوم پرستی کے جذبے سے اس قدر سرشار اور مغلوب تھے کہ اس راہ میں نظر آنے والی رکاوٹوں کو شدید نکتہ چینی کا ہدف بناتے تھے اور انھیں کسی صورت میں برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ چناں چہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ مذہبی متعصبانہ رویوں کے باعث ہندوستانی قوم پرستی پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اس کا فروغ متاثر ہوتا ہے تو وہ مسجد اور مندر کے اجارہ داروں کو یکساں تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور سب کو محبت، پیار اور پریم کا درس دیتے ہیں:

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

کہا جاتا ہے کہ یہ ان کے ابتدائی عہد کی شاعری ہے لیکن جاوید نامہ تو بانگ درا کے بعد کے دور کا کلام ہے۔ اس میں انھوں نے استخلاص وطن کے لیے نہرو خاندان کی

جدوجہد، درس حریت اور قربانیوں کو زبردست خراج تحسین ادا کیا ہے اور اس پر فخر کا اظہار کیا ہے کہ وہ بھی خطہء کشمیر کے برہمن زادے ہیں:

ہندوار ایں ذوق آزادی کہ داد
صیدرا سودائے صیادی کہ داد
آں برہمن زادگانِ زندہ دل
لالہء احمر زروے شاں خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش
از نگاہِ شاں فرنگ اندر خروش
اصل شاں از خاک دامن گیرِ ماست
مطلع ایں اختراں کشمیرِ ماست
خاک مارا بے شرح دانی اگر
بردرونِ خود یکے بکشا نظر !
ایں ہمہ سوزے کہ داری از کجا ست
ایں دم باد بہاری از کجا ست !
ایں ہماں باد است کزتا شیراو
کوہسارما بگیرد رنگ و بو

عمر کے آخری ایام میں وہ ہندوستانی قوم پرستی اور مسلمان قوم پرستی دونوں راہوں کو ترک کر کے عالمگیریت کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ جنانچہ ۱۹۳۸ء کے نوروز کے موقعے پر ان کا پیغام اس کا واضح ثبوت ہے جسے ریڈیو لاہور سے نشر کیا گیا تھا۔

قائد اعظم محمد علی جناح انڈین نیشنلزم کے بہت بڑے حامی کار تھے۔ ان کی تمام زندگی ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستانی قوم پرستی کی تبلیغ پرچار میں بسر ہوئی۔ اگر ۱۹۳۷ء میں کانگریس کی قیادت اور گاندھی جی سیاسی فراست سے کام لیتے ہوئے جناح کی

خواہش کی تکمیل کر دیتے جس کا اظہار بی ۔جی ۔کھیر کے ذریعے کیا گیا تھا اور صوبہ بمبئی میں کانگریس مسلم لیگ مخلوط حکومت قائم ہو جاتی تو جناح انتقام پر اتر کر علاحدہ وطن کے قیام کا مطالبہ ہر گز نہ کرتے ۔لیکن گاندھی جی نے دامن چھڑا کر فرار کی راہ اختیار کی اور ہندوستان کی تقسیم کی بنیاد ڈال دی ۔مولانا ابو الکلام آزاد نے لکھا ہے کہ یوپی میں مسلم لیگ سے سمجھوتا نہ ہو سکا، مسٹر جناح نے صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور جارحانہ اقدامات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا جس کا آخری نتیجہ پاکستان کا قیام تھا (ہماری آزادی، ص ۲۳۶)۔

اس وقت تک صوبہ یوپی میں ہی وزارت سازی کے حقائق سامنے آئے تھے ۔ لیکن اگر کانگریس صرف صوبہ بمبئی مسلم لیگ کے ساتھ جناح کی خواہش کے مطابق مخلوط وزارت سازی کر لیتی تو جناح کا ہندوستانی قوم پرستی پر یقین بدستور قائم رہتا اور انھوں نے بعد میں مسلمانوں کے علاحدہ قوم ہونے کی بنیاد پر جو عمارت تعمیر کی اس کی نوبت نہ آئی ۔انھوں نے ۱۹۳۷ء کے انتخاب کے بعد واضح الفاظ میں پیش کش کی تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان باوقار مصالحت پر مجھ سے زیادہ خیر مقدم کرنے والا کوئی نہ ہو گا اور مجھ سے زیادہ کوئی مددگار ثابت نہ ہو گا۔انھوں نے مسئلہ سلجھانے کے لیے گاندھی جی سے اپیل بھی کی جو نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی تھی۔

۱۹۴۶ء کے انتخاب کے بعد جب وزارت سازی کا مرحلہ آیا تو مولانا آزاد کی پختہ رائے تھی کہ "مسلم لیگ کے ساتھ فیاضی کا سلوک کیا جائے" اس اصول پر عمل کرتے ہوئے مولانا نے لیگ کے منتخب ممبران اسمبلی سے رابطہ قائم کیا اور وزارت میں شمولیت کی دعوت دی ۔ یہ رویہ ہر دو جگہوں پر اختیار کیا۔ جن صوبوں میں کانگریس کو ایوان میں مکمل اکثریت حاصل تھی اور کسی دوسری جماعت کے تعاون کی ضرورت نہ تھی اور ان صوبوں میں بھی جہاں کانگریس ایوان کی واحد بڑی پارٹی تھی ۔ مسلم لیگی ممبران اسمبلی ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۶ء دونوں مرتبہ وزارتوں میں شامل ہونے کے لیے تیار

تھے۔ لیکن تب گاندھی رضا مند نہ ہوئے اور اب جناح۔ اگر سیاسی فراست، فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا جاتا تو ہندوستان کے مستقبل کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا لیکن کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے دور اندیشی کا مظاہرہ نہ کیا۔ اصل سیاسی قوت کو نظر انداز کیا اور وزارت سازی کے لیے آزاد ارکان اور چھوٹی جماعتوں پر انحصار کیا۔ بنگال اور سندھ میں مسلم لیگ کو انگریز ممبروں کا مرہونِ منت ہونا پڑا اور پنجاب میں کانگریس کو یونی نسٹ پارٹی کی ناز برداری کرتے ہوئے صوبہ کی پریمیر شپ سردار خضر حیات خاں ٹوانہ کے حوالے کرنا پڑی تھی۔ اس سے وقتی طور پر تو راستہ نکل آیا لیکن مستقل رخنہ پڑ گیا۔

اس داستان سرائی کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ قومیت کا تصور سیاست سے منسلک ہے۔ مذہب یا دینی عقیدے سے ہرگز نہیں۔ جیسا کہ مسلم لیگ یا اسی فلسفہ، سیاست کی حامی جماعتیں پیش کرتی رہیں۔ اس پر گاندھی جی نے استفسار کیا تھا اور بالکل بجا تھا کہ کسی شخص کے مذہب تبدیل کرنے سے اس کی قومیت کس طرح تبدیل ہو جاتی ہے؟ یہ سوال اس قدر ٹھوس اور وزن دار تھا کہ علاحدہ مسلم قوم کے کسی پشتیبا سے اس کا جواب نہ بن پڑا تھا اور یہ سوال ہنوز تشنہ، جواب ہے۔

تحریک عدم تعاون اور تحریک خلافت کے زمانے میں مخالفین نے یہ نکتہ اٹھایا کہ مسلمان اور غیر مسلم ایک قوم نہیں ہو سکتے۔ تحریک کے حامی علمائے دین نے اس کے جواب میں میثاق مدینہ کی مثال دی اور کہا کہ:

> "ہندوستان میں ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے جب تک احکام اسلامیہ کے تحت ہندوستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کر لیں ...... ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان ہندوستان کے بائیس کروڑ ہندو بھائیوں سے مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندوستان کی ایک قوم اور ایک نیشن بن جائیں

...... خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان تھی۔ اس مقدس وجود نے عہد نامہ لکھا۔ بعینہٖ یہ اس کے الفاظ ہیں "انہ امۃ واحدۃ" ہم ان قبیلوں سے جو اطراف مدینہ میں بستے ہیں صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک نیشن بننا چاہتے ہیں ایک قوم بننا چاہتے ہیں۔"

تب مولانا سندھی ہندوستان میں موجود نہ تھے بلکہ بیرون ہند محاذ پر برسرپیکار تھے۔ ان کی عملی اور فکری توانائیاں اسی مقصد کے لیے صرف ہو رہی تھیں۔ انھوں نے حصول مقصد کے لیے کابل میں بیٹھ کر کانگریس تشکیل کی اور اس کا الحاق آل انڈیا نیشنل کانگریس سے کیا۔ وہ عمر بھر متحدہ ہندوستانی قومیت کے فلسفے پر صدق دل سے قائم رہے اور اس کی ترویج واشاعت کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ قیام افغانستان کے دوران میں عالمی سطح پر بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کر دیے گئے تھے، خلافت اسلامیہ کا حدود اربعہ سکڑ گیا تھا اور خلافت کا مستقبل بھی ناقابل یقین ہو چکا تھا جس کی بساط آخر کار اتاترک نے لپیٹ دی۔ روس کی زارشاہی کا خاتمہ ہو چکا تھا اور نئے سیاسی و اقتصادی نظام سوشلزم کا تجربہ شروع ہو چکا تھا۔ مولانا سندھی کے نزدیک یہ اسلام کی عملی تفسیر تھی۔ انھوں نے شکست خوردہ ترکی کا دورہ بھی کیا، وہاں خلافت کا خاتمہ ہوتے اور جدید ترکی کی داغ بیل پڑتے دیکھی۔ وہاں سے مکہ معظمہ چلے گئے، جہاں سعودیوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور حسین شریف مکہ کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ان ممالک میں تبدیلیوں کے مشاہدے اور نئے تجربات سے مولانا کے غور و فکر اور سوچ بچار کے زاویوں میں مزید وسعت آئی۔ انھوں نے تقریباً ربع صدی کا عرصہ ہندوستان سے باہر گزارا۔ اس سے ان کے سیاسی، اعتقادات، افکار اور مسلک میں کوئی ابہام نہ رہا بلکہ استحکام پیدا ہوا۔ وہ خود فرماتے ہیں:

"ہمیں ماسکو میں انقلاب روس کے نتائج دیکھنے کا پہلا موقع ملا۔ انقلاب کا پورا مطالعہ کرنے کے لیے، ہماری کمیٹی کے بعض ممبروں نے روسی زبان سیکھی۔ ہمیں روس کی اہم شخصیات سے تبادلہ خیالات کے اچھے مواقع ملے۔ یورپ کے دیگر ممالک پر انقلاب روس کے جو اثرات مرتب ہوئے ان کے مطالعے کے لیے، ہماری کمیٹی کے ممبران ان ملکوں میں گئے۔ ہم نے ترکی کے انقلاب کا بھی مطالعہ کیا، انقرہ اور استنبول کو اچھی طرح دیکھا۔"

مولانا مارچ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان واپس آئے تو یہاں فرقہ وارانہ سیاست فروغ پا رہی تھی اس کی گرفت اور وسعت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اقتصادی کساد بازاری کے باعث یورپ بڑی تیزی سے جنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مولانا کی دور بیں نگاہ عالمی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ چناں چہ انھوں نے اپنی ہندوستان آمد کے صرف تین ماہ بعد جمعیت علماے ہند صوبہ بنگال کے اجلاس کلکتہ جون ۱۹۳۹ء میں خطبہ صدارت دیا۔ اس سے ان کے سیاسی، سماجی، اقتصادی افکار و نظریات اور عزائم پر بڑی روشنی پڑتی ہے۔ ان کا کہنا تھا:

۱۔۔۔ دنیا میں ایک عالمگیر انقلاب آرہا ہے۔ ہندوستان اس عالمگیر انقلاب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا۔

۲۔۔۔ ہماری سیاست نیشنلزم کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔

۳۔۔۔ ہندو، مسلمان، سکھ اور دوسرے فرقوں کے اہل علم و فکر اپنے اپنے مذہب کی حقیقی روح اور سوشلزم میں مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کریں اس سے عوام کو جلد بیدار کیا جاسکے گا۔

۴۔۔۔ قومی تحریک میں مذہبی مراسم کو داخل کرنا خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے ہو، ملک کو تباہی کی طرف لے جائے گا۔

تب جو حالات درپیش تھے اور فرقہ وارانہ سیاست جس تیز رفتاری سے وسعت

پذیر تھی اس کے پیش نظر مولانا نے اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہوئے نہایت دانشمندانہ قدم اٹھایا تاکہ ہندوستان کا اتحاد اور سالمیت کو برقرار رکھا جاسکے۔ چناں چہ انھوں نے ۲۴ دسمبر ۱۹۳۹ء کو جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی کی نیو اٹھائی۔ اس کے اساسی پروگرام کی ایک شق یہ تھی:

"جس طرح گنگا جمنا کا دوآبہ ہندو تہذیب کا منبع ہے، اسی طرح سندھ ساگر مسلم تہذیب کا معدن ہے۔ اگر ہم ان دو عظیم قطعات کا اپنے نظریے پر سمجھوتا کراسکے، ان کی تالیف قلوب پر قادر ہوسکے تو اس لاینحل مشکل کی کلید مل جائے گی۔"

کانگریس اور مسلم لیگ میں عدم اعتماد کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جارہی تھی۔ مسلم لیگ بدگمانیاں پھیلانے اور طرح طرح کی الزام تراشیوں میں مصروف تھی۔ یہاں تک کہ غیر لیگی مسلمان اپنی سیاست کی بنا پر اس کے نزدیک گردن زدنی تھے۔ ان حالات میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا ۵۲ واں سالانہ اجلاس ۱۷ تا ۱۹۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو رام گڑھ میں منعقد ہوتا ہے۔ جہاں آئندہ برس کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کو کانگریس کا صدر چنا جاتا ہے۔ اس موقعے پر مولانا آزاد نے سیاسی فضا میں موجود غلط فہمیاں اور مسلم لیگ کے اندیشوں اور وسوسوں کو دور کرنے کے لیے معرکہ آرا خطبہ دیا۔ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے وفاق کا حل تجویز کیا۔ جس کے پاس کم از کم اختیارات ہوں گے اور صوبے یا وفاقی اکائیاں زیادہ با اختیار ہوں گی۔ لیکن مسلم لیگ کے شیشۂ دل پر جو غبار آچکا تھا دور نہ ہوا۔ مسلم لیگ نے چند یوم بعد اپنے اجلاس لاہور میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے علاحدہ وطن کے قیام کا مطالبہ کر ڈالا۔

علاحدہ وطن کے قیام کا مطالبہ کرتے وقت مسلم لیگ نے اس کے حق میں جو استدلال کیا تھا، مولانا عبید اللہ سندھی اس سے متفق نہ تھے۔ چناں چہ انھوں نے ایک واقعہ اپنے موقف کے حق میں بطور دلیل پیش کیا۔ کانگریس کے ایک سندھی رہنما

اچاریہ کرپلانی (بعد میں کانگریس کے صدر بھی بنے) کے بھائی (شیخ عبدالمجید سندھی) نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مولانا نے اس کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ اسلام قبول کرنے سے وہ اس وطن کی تاریخ سے بے دخل نہیں ہو گیا اور نہ ہی اچاریہ کرپلانی کو ملکیت وطن کی اجارہ داری حاصل ہو گئی ہے۔ جو شخص اسلام کی اعلیٰ تعلیم سے متاثر ہو کر ہندو مذہب چھوڑ دے تو وہ اجنبی نہیں ہو جاتا اور ہندو مذہب پر جما رہنے والا ہی خالص اہل وطن نہیں ہوتا۔ تبدیلی ذہن، فکر اور عقیدے میں آتی ہے، وطنیت میں نہیں۔ جب میں مسلمان نہیں تھا، میرا وطن ہندوستان تھا اور اب میں مسلمان ہوں تب بھی میرا وطن یہی ہندوستان ہے۔ مذہب بدلنے سے وطن نہیں بدلتا۔

انھوں نے مزید کہا: "دیکھو میرا ایک دماغ ہے، دوسرا میرا جسم ہے۔ اگر میرے دماغ کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ میں اپنے جسم کا انکار کر دوں تو مجھے ایسی ترقی قبول نہیں۔ یہ میری ذات کی نفی ہے۔ میں سندھی یا پنجابی ہوں اور یہاں دہلی میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اس کام کے لیے مجھے اپنے سندھی یا پنجابی ہونے کا انکار کرنا پڑے تو میں اس کام کو اپنی ذاتی ہلاکت سمجھوں گا۔ میرے وجود کا ثبوت ہر حال میں ضروری ہے۔ کسی کو اس کے خیالات کی وجہ سے قومی وجود سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔

جون ۱۹۴۱ء میں صوبہ، مدراس کے مقام کمبا کونم میں تقسیم ہند کی تجویز کے خلاف اینٹی سپریشن (Anti Separation) کانفرنس ہوئی۔ اس میں مولانا نے دو چیزوں پر بطور خاص زور دیا۔ ایک یہ کہ اسلام کے کسی قسم کے بین الاقوامی سیاسی اتحاد کا خیال دماغ سے نکال دیا جائے اور یہ کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ پریشاں خیالی اور پسماندگی کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے وطن کی بجائے باہر کے اسلامی ملکوں کی طرف برابر دیکھتے رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا:

> "پچھلے پچاس ساٹھ برس سے ہندوستانی مسلمان انقلابی خود اعتمادی کھونے کے بعد بیرونی مسلمانوں کی تھپکیوں سے اور زیادہ غلط اندیش بنتا چلا گیا۔"

دوسرے مسلم لیگی قیادت خوش آئند آرزوؤں کے تحت براعظم کی تقسیم کا مطالبہ کررہی ہے۔

تحریک پاکستان کے زمانے میں ایک نعرہ یہ بھی بلند ہو رہا تھا کہ اگر ہندوستان میں مسلم اقلیت کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا تو اس کا بدلہ پاکستان کی ہندو اقلیت سے لیا جائے گا۔ یہ خیال اور انداز فکر ہی سرے سے غیر سیاسی، غیر جمہوری، غیر اخلاقی، غیر انسانی بلکہ غیر اسلامی تھا۔ دیگر معقول اور دانشمند سیاستدانوں کی طرح مولانا کے نزدیک بھی یہ سب ہوائی باتیں تھیں۔ انھوں نے مدراس کے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ "آپ ایسی اسکیمیں بنانے والوں کی باتوں پر کان نہ دھریں اور اسے "مشت بعد از ہنگام جنگ کہہ کر ٹال دیں۔" بعد کے واقعات سے ثابت ہوا کہ مولانا اور ان کے مکتب فکر کے دیگر حضرات نے اپنی سیاسی فراست، دور اندیشی، بصیرت اور بصارت کی بنا پر جس رائے کا اظہار کیا تھا حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ ہندوستانی مسلمان آج بھی اس کی قیمت اپنے خون سے چکا رہا ہے۔ اس پر سوائے زبانی اور کاغذی احتجاج کے اور کچھ نہیں ہو رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ کچھ ہو بھی نہیں سکتا اور نہ ہی کوئی کچھ کر سکتا ہے۔

پھر یہ سب کچھ کس قدر حیران کن اور استعجاب انگیز ہے کہ جس نظریے اور فلسفے کی نیو کانگریس کے قوم پرست فکر کی مخالفت پر اٹھائی گئی تھی، تحریک پاکستان کے زمانے میں اس کے خلاف دلیلیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیش کی گئیں۔ جب مسلم لیگ کے تقسیم کے اصول کے مطابق کانگریس اور برطانیہ نے پنجاب، بنگال اور آسام کی تقسیم پر اصرار کیا تو مسلم لیگ کی طرف سے ان صوبوں کو متحد رکھنے کے لیے وہی دلیلیں دی گئیں جو کانگریس کی سیاست کی بنیاد تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح نے وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے کہا:

" لوگ پہلے پنجابی اور بنگالی ہیں جب کہ بعد میں ہندو اور مسلمان ...... ان کی معیشت، تاریخ، زبان اور ثقافت مشترکہ ہے، آپ ان کو تقسیم نہیں کر سکتے۔ اس طرح ناقابل اختتام خوں ریزی اور تنازعات کے اسباب پیدا ہو جائیں گے۔"

ماؤنٹ بیٹن نے جناح کے خیالات سے مکمل اتفاق کیا اور کہا:

" یقیناً ایسا ہی ہے۔ لوگ مسلمان اور ہندو ہونے سے پہلے نہ صرف پنجابی اور بنگالی ہیں بلکہ وہ سب سے پہلے ہندوستانی ہیں۔ آپ نے ہندوستان کو متحد رکھنے کے لیے لاجواب دلائل دیے ہیں۔

(فریڈم ایٹ مڈ نائٹ، ص ۱۱۹)

آخر میں قائداعظم محمد علی جناح کی تقریر ۱۱۔ اگست ۱۹۴۷ء کا تذکرہ انتہائی اہم ہے اس کی اہمیت بدیں وجہ بہت زیادہ ہے کہ ایک تو وہ اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر تھے، انھوں نے اسی حیثیت میں مسلمانوں کا مقدمہ لڑا تھا اور دو قومی نظریے کی بنا پر علاحدہ وطن حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس تقریر کی اہمیت اس وجہ سے اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ انھوں نے یہ تقریر پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب ہونے کے بعد کی تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں نوزائیدہ مملکت کے مستقبل کے آئین کی بنیادیں فراہم کر دی تھیں۔ یہ کانگریس کے نظریہ، سیاست نیشنلزم سے بالکل ہم آہنگ تھی اور مسلم لیگ کے فلسفہ، سیاست دو قومی نظریے سے متصادم و متحارب۔ مزید برآں تب محمد علی جناح پاکستان کے گورنر جنرل مقرر ہو چکے تھے، صرف رسمی کارروائی باقی تھی۔ انھوں نے نئی ریاست کا نصب العین متعین کر دیا۔ اہل الرائے کے نزدیک یہ ان کی زندگی کی بہترین تقریروں میں سے ایک تھی:

" اب اس امر کو بطور نصب العین ہمیں اپنے سامنے رکھنا چاہیے اور آپ دیکھیں گے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے، مذہبی معنوں میں نہیں، کیوں کہ وہ ہر فرد کا

ذاتی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے ایک ریاست کی شہریوں کی حیثیت میں۔"

"وقت کے ساتھ ساتھ اکثریت و اقلیت کے یہ اختلافات، ہندو قوم اور مسلمان قوم کی تفریق، کیوں کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، آپ کے اندر پٹھان، پنجابی، شیعہ، سنی وغیرہ موجود ہیں، اسی طرح ہندوؤں میں برہمن، وشنو، کھشتری نیز بنگالی اور مدراسی وغیرہ موجود ہیں، ختم ہو جائے گی۔ حقیقت میں اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو میں کہوں گا کہ ہندوستان کی آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ مذہبی تفریق ہی تھی ورنہ ہم بہت پہلے آزادی حاصل کر لیتے۔"

جناح کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ تاریخ نویسوں اور تجزیہ نگاروں نے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں، خیالات اور افکار کا اپنے اپنے انداز میں تجزیہ کیا اور مختلف آرا قائم کیں۔ ان سے اختلاف اور اتفاق بھی ممکن ہے، لیکن اس تقریر کے بارے میں سب متفق ہیں اور کسی نے اختلاف نہیں کیا کہ یہ تقریر نیشنلزم کی بہترین آئینہ دار ہے۔ "جناح آف پاکستان" کے مصنف نے اسٹینلے وول پرٹ کا دقیع اور بلیغ تبصرہ نقل کیا جاتا ہے:

"اپنے موقف سے شاندار پسائی، گویا راتوں رات وہ ایک بار پھر ہندو مسلم اتحاد کے سفیر بن گئے، جس پر سروجینی نیڈو جان چھڑکتی تھی۔ ان کا ذہن بڑی تیزی سے منطقی ربط کی طرف رجوع کر رہا تھا۔ وہ لوگوں کے ساتھ آزادانہ گھل مل رہے تھے اور برجستہ نیز بے ربط باتیں کر رہے تھے۔ کیا واقعی وہ معاملہ ختم ہو گیا تھا؟ یا شروع ہونے والا تھا؟"

(ص ۳۳۹)

"وہ کیا کہہ رہے تھے؟ ان کی باتوں کا مطلب کیا تھا؟ کیا وہ واقعی فراموش کر بیٹھے تھے کہ میں کیا ہوں؟ کیا حالات کی گردش نے انھیں اس قدر اپنے مسلک سے بھٹکا دیا تھا کہ اب وہ فریق مخالف کے نقطہ نظر کی حمایت کر رہے تھے، کیا وہ قیام پاکستان کے موقعے پر ان لاکھوں خوفزدہ اور معصوموں،

جو ذبح ہوئے ، جنھیں اپنے گھر بار ، کھیت کھلیان اور آبائی دیہاتوں سے راہِ فرار اختیار کر کے ، ان کی یادوں کو ہمیشہ کے لیے بھلا کر ایک اجنبی سرزمین کے پناہ گزیں کیمپ میں پناہ لینا پڑی تھی ، کے سامنے متحدہ ہندوستان کی وکالت کر رہے تھے ؟"

(ص ۳۴۰)

اس ساری بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی کے تصورِ قومیت کی بنیاد نیشنلزم تھی ۔ جن گروہوں یا عناصر نے اس سے اختلاف کیا ، پرچار کیا اور اس کے لیے جدوجہد کی تو جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور پاکستان معرض وجود میں آگیا تو ان کی سیاست کا رخ بھی قوم پرستی کی جانب پھر گیا ۔ بہرحال مولانا سندھی اپنے نظریہ قومیت پر مستقل مزاجی سے قائم رہے ۔ گردوپیش کا جذباتی ماحول اور نعرہ بازی ان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ کر سکی ، بلکہ جو لوگ اس راہ کو چھوڑ گئے تھے ان کی علاحدگی بھی عارضی ثابت ہوئی اور وہ بھی صراط مستقیم کی طرف لوٹ آئے اگرچہ اسلامیانِ ہند کو اس کی بڑی گراں قیمت ادا کرنا پڑی اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے ۔

تیسری نشست

۹۔ ستمبر ۱۹۹۴ء

صدر

ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی

مہمانِ خصوصی

قاری شیر افضل خان

نائب صدر جمعیت علمائے اسلام، صوبہ سندھ

مقالات

مولانا سندھیؒ کا سرور اجیہ پروگرام .... تاریخ، تجزیہ اور زمانہ مابعد کی سیاسی فکر پر اس کے اثرات — پروفیسر سید شفقت رضوی

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی خدماتِ سندھ .... ایک سرسری نظر — ڈاکٹر ابو سلمان سندھی

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا انقلابی سیاسی منشور — پروفیسر محمد اسلم

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے بارے میں پروفیسر محمد سرور جامعی کی تالیفات — مولانا محمد اسحاق بھٹی

امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ — سید اکبر شاہ ہاشمی



قاری شیر افضل خان

نائب صدر جمعیت علمائے اسلام، صوبہ سندھ

مولانا سندھیؒ کا سرور اجیہ پروگرام

تاریخ، تجزیہ اور زمانہ ، مابعد کی سیاسی فکر پر اس کے اثرات

پروفیسر سید شفقت رضوی

پس منظر:

برصغیر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں مولانا عبید اللہ سندھی کو کئی اعتبار سے فضیلت حاصل ہے ۔ وہ ایسی برگزیدہ ہستی تھے جن کی روح میں حقیقی تعلیمات اسلام سرایت کی ہوئی تھیں ۔ وہ اسلام کی ترویج، اس کی اسپرٹ کے احیاء، مسلمانوں کی بقا و ترقی، ان کے سیاسی اور سماجی حقوق کے تحفظ کے لیے زندگی بھر کوشاں رہے ۔ مذہب کے معاملے میں ان کے افکار شاہ ولی اللہ کے خیالات کی توسیع تھے ۔ وہ ایسے محب وطن تھے جو اپنی حریت نوازی اور انقلاب پسندی کے ذریعے ہر قیمت پر وطن عزیز کو انگریز استعمار کے چنگل سے آزاد کرانا چاہتے تھے ۔ اس کے لیے انھوں نے ربع صدی (۱۹۱۵ء تا ۱۹۳۹ء) یعنی ایک تہائی زندگی جلاوطنی میں گزاری ۔ وہ افغانستان، ترکی، جرمنی اور روس کی مالی و فوجی اعانت کے ذریعہ بدیسی حکمرانوں کو ملک سے نکالنے کی عملی جدوجہد کرتے رہے ۔ انھوں نے ۱۹۱۵ء میں حکومت موقتہ ہند قائم کی ۔ برصغیر کی شمال مغربی سرحدوں پر حملہ کرنے اور ملک میں بغاوت برپا کرنے کا منصوبہ بنایا، جسے انگریزوں نے "ریشمی رومال سازش" کا نام دیا ۔ لیکن منصوبے کے قبل از وقت افشا ہو جانے سے مقصد حاصل نہ ہو سکا ۔ جب امیر امان اللہ خان افغانستان کے حکمران بنے تو انھیں راضی کر کے مئی ۱۹۱۹ء میں سپہ سالار محمد نادر خان کی سرکردگی میں سرحد پر حملے شروع

کروائے۔ ان حملوں میں یوپی، پنجاب، سرحد اور سندھ سے کابل ہجرت کرنے والے نوجوان شامل تھے۔ ٹھل کے معرکہ کے بعد انگریزوں نے دب کر افغانستان کی شرطوں پر صلح کرلی اور راولپنڈی معاہدہ (۸۔اگست ۱۹۱۹ء) کے ذریعہ اس کی خودمختاری تسلیم کر لی۔ انگریزوں نے افغانستان کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کی شرط مان لی اور اس کے بدلے یہ شرط عائد کردی کہ حریت پسندوں کو بے اثر کردیا جائے۔

مولانا سندھی کے لیے یہ صورتِ حال مایوس کن تھی۔ انھیں روس کی اعانت حاصل کرنے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ روس میں اکتوبر انقلاب کے بعد "پرولتاری سوشلسٹ" حکومت قائم ہوچکی تھی جو تمام ملکوں کی آزادی کا دم بھرتی تھی۔ برصغیر میں عدم تعاون اور خلافت کی تحریکات کا زور تھا۔ قیادت گاندھی جی کے ہاتھ میں تھی، انھوں نے اعلان کیا تھا کہ تلک سوراج فنڈ کے لیے ایک کروڑ روپیہ، انڈین نیشنل کانگریس کے لیے ایک کروڑ روپیہ فراہم ہوجائے اور کم ازکم ستر لاکھ گھروں میں چرخے چلنے لگیں تو اس کے عوض وہ ہند کو آزادی کا تحفہ دلادیں گے۔ مولانا سندھی کا رابطہ یہاں کے سیاسی رہنماؤں سے قائم تھا۔ وہ متذکرہ تحریکات سے واقف تھے۔ انھوں نے روس جاکر جدوجہدِ آزادی میں اس کی مدد حاصل کرنا چاہی۔ اپنی حیثیت کو نمائندہ تسلیم کروانے کے لیے انھوں نے ۱۹۲۲ء میں "کانگریس کمیٹی کابل" قائم کی۔ وہ کمیٹی کے صدر اور ظفر حسن سیکریٹری بنے۔ انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس سے کمیٹی کے الحاق کی درخواست کی جو "گیا" اجلاس میں منظور ہوئی۔ اس کی اطلاع انھیں اس وقت ملی جب وہ ماسکو پہنچ چکے تھے۔ مولانا کا روس میں قیام ۱۰۔ نومبر ۱۹۲۲ء سے وسط جولائی ۱۹۲۳ء تک رہا۔ اس دوران انھوں نے ماسکو میں روس کے وزیرِ خارجہ چیچرن سے متعدد ملاقاتیں کیں جن میں انھوں نے تجویز کیا کہ؛

۱۔ "فی الحال انڈین نیشنل کانگریس کو ایک کروڑ روپیہ جانا چاہیے جس کو ہندوستان قرض سمجھے گا اور آزاد ہونے پر اس کو روس کو واپس کردے گا۔"

۲۔ " افغانستان بھی روس کے ساتھ مل کر کام کرے کیوں کہ روس کے لیے ہندوستان سے تعلق پیدا کرنے اور اس کو برقرار رکھنے کا سب سے محفوظ راستہ افغانستان کا ہے۔ .... ایک کروڑ روپیہ ہندوستان سے تعلق بنانے اور اس کو قائم رکھنے کے لیے روس کو راستہ دینے کے عوض بھیجنا چاہیے۔

(ظفر حسن: آپ بیتی: منصور بک ہاؤس، لاہور، س۔ن، صفحہ ۵۳)

مولانا نے سپہ سالار نادر خان کی ضمانت حاصل کرنے کی یقین دہانی کروائی۔ ان کا خیال تھا کہ " وہ (نادر خان) اس قسم کی مالی امداد ہمارے ذریعہ حاصل کرنے کے بعد اس قدر طاقتور اور بارسوخ ہو جائیں گے کہ امیر امان اللہ خان ان کے مشورہ کے بغیر کوئی قدم اٹھا نہ سکیں گے۔

(ظفر حسن: حوالہ مذکورہ: صفحہ ۵۴)

چیچرن نے چوتھی ملاقات میں یقین دہانی کروائی کہ روس کی حکومت ان کی تجاویز مان لے گی۔ وہ ہندوستانی رہنماؤں اور محمد نادر خان سے رابطہ پیدا کریں۔ ماسکو میں رہتے ہوئے رابطہ کی کوئی صورت نہیں تھی، مولانا نے ترکی کو جانا مناسب سمجھا اور جولائی ۱۹۲۳ء میں اپنے بھتیجے عزیز احمد کے ساتھ رخصتِ سفر باندھا۔

ترکی میں قیام کے دوران انھوں نے کانگریسی رہنماؤں سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ کانگریس کے زعما کی سرد مہری تھی۔ البتہ لالہ لاجپت رائے استنبول گئے تھے اور مولانا سے ملاقات کی تھی۔ مولانا کے منصوبے سے واقف ہونے پر سخت برہم ہوئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ تحریکِ آزادی میں کوئی بھی مسلمان ملک بالخصوص افغانستان سے مدد لی جائے۔

مولانا حسین احمد مدنی نے "کابل میں سات سال" میں لکھا ہے:

" مولانا سے مل کر لالہ جی وطن پہنچے تو اپنی ملاقات کے حوالے سے انھوں نے مولانا کے خلاف پروپیگنڈے کی ایک زبردست مہم شروع کر دی، جس کی لپیٹ میں مسلمانوں کے علاوہ کانگریس بھی آگئی۔ اسی زمانہ میں شدھی

اور اس کے جواب میں تبلیغ کا دور دورہ ہوا۔ سنگھٹن اور تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ فرقہ وارانہ فسادات کثرت سے ہونے لگے اور ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ پس پشت ڈال دیا گیا۔

(مولانا حسین احمد مدنی: مولانا عبید اللہ سندھی، کابل میں سات سال: مرتبہ محمد سرور: سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور ۱۹۷۶ء: صفحہ ۱۳۹)

اسی حوالے سے ظفر حسن نے لکھا ہے کہ:

"قبلہ مولانا صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کے خیال میں لالہ لاجپت رائے نے ہندوستان جا کر یہ خبر اپنے سیاسی گرو مدن موہن مالوی کو پہنچائی جس سے ہندوستان میں ۱۹۲۴ء میں ہندو مسلم تعلقات سخت خراب ہو گئے۔"

(ظفر حسن: حوالہ مذکورہ: صفحہ ۸۸)

ہندوستان میں جو صورتِ حال رونما ہوئی اس کا تجزیہ کرتے ہوئے قاضی عبد الغفار نے لکھا ہے کہ:

"پستی اور آپس کی پھوٹ اور فرقہ واریت کا ایک نیا دور شروع ہوا اور ملک فرقہ وارانہ جھگڑوں کی آگ میں کود گیا۔"

(قاضی عبد الغفار: حیاتِ اجمل: مطبوعہ دہلی: صفحہ ۲۶۸)

لالہ لاجپت رائے کے بعد ڈاکٹر مختار احمد انصاری دوسرے رہنما تھے جنھیں مولانا نے منصوبے سے آگاہ کیا اور کانگریسی رہنماؤں تک بات پہنچانے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کا بھی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

برصغیر کے حالات انتہائی تشویش ناک ہوتے جا رہے تھے۔ ان کا علم ہندوستان سے آنے والے اخبارات کے ذریعہ مولانا کو ہوتا رہا۔ وہ جنگِ آزادی کے سپاہی ہونے کے علاوہ ایک سیاسی مفکر بھی تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ انھوں نے تاریخ پڑھی ہی نہیں تھی بلکہ اس سے نتائج بھی اخذ کیے تھے۔ اپنی فکر کے ذریعہ انھیں اندازہ ہو چکا تھا کہ ہندوستان میں بسنے والوں میں مذہبی اختلاف کے علاوہ نسلی، علاقہ

واری اور طبقہ واری اختلافات بھی موجود تھے جو مذہبی مناقشات میں دب گئے تھے، فنا نہیں ہوئے تھے۔ چناں چہ انھوں نے لکھا ہے کہ:

"اگر تعمق سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف ان دو فرقوں میں باہمی اختلاف ہے بلکہ ہر ایک فرقہ کے اندر قومی اور معاشرتی تقسیمات موجود ہیں۔ مسلمانوں میں پنجابی، سندھی، ہندوستانی، پٹھان، کشمیری اور بلوچی کا قومی سوال موجود ہے تو ہندوؤں میں بنگالی، بہاری، مدراسی، مرہٹی، گجراتی، مارواڑی کا مسئلہ پایا جاتا ہے۔ ان قومی اختلافات کو مذہبی یگانگت بھی نہیں مٹا سکتی۔"

"اسی کے بعد ہر ایک قوم میں طبقاتی پیچیدگی موجود ہے۔ مال دار اور محنت کش، زمیندار اور کسان، سرمایہ دار اور مزدور کی باہمی کشاکش ہے۔ ہر ایک ہندوستانی قوم کو وہ متقابل اور متعارض صفوں میں بہ آسانی تقسیم کر سکتی ہے۔"

(دیباچہ سرور اجیہ پروگرام۔ بحوالہ رسالہ تاریخ و سیاسیات، فروری ۱۹۵۴ء، صفحہ ۱۶)

مولانا نے جن اختلافات کا ذکر کیا ہے ان کے علاوہ بھی ہندوؤں میں اونچی اور پست ذاتوں کا اختلاف بے حد اہم ہے۔ حصول مفادات و مقاصد کے لیے اونچی ذات کے ہندو پست اقوام یعنی اچھوتوں کو اپنے میں شامل کر لیتے ہیں لیکن سماجی رتبہ اپنے برابر دینے کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔ متذکرہ اختلاف کی وجہ سے ہی یہ ملک سیاسی طور پر کبھی وحدت نہیں رہا۔ اشوک، اورنگ زیب اور انگریزوں نے بزورِ طاقت وقتی طور پر وسیع حکومتیں قائم کیں لیکن ملک اور قوم کی وحدت کا تصور پیدا نہ کر سکے۔

مذہبی اور دیگر اختلافات کی وجہ سے مولانا کو یقین ہو گیا کہ اقوام ہند کے درمیان اتحاد پیدا کرنا ممکن نہیں۔ دائمی امن و سکون کے لیے کوئی راہ نکالنا ضروری تھا چناں چہ "انھوں نے ۱۹۱۹ء میں تقسیم ہند کی تجویز پیش کی تھی۔"

(پروفیسر محمد اسلم، دیباچہ مولانا عبید اللہ سندھی کے سیاسی مکتوبات، لاہور، صفحہ ۱۸)

۱۹۲۴ء میں پیدا ہونے والے حالات جن کی وجہ سے مسلمانوں کے جان، مال

اور عزت کو شدید ترین خطرہ لاحق ہو گیا تھا مولانا کو سنجیدگی سے اس کے حل کے بارے میں غور و فکر کرنا پڑا۔ انھوں نے ایسا منصوبہ بنانا چاہا جس کے ذریعے مسلم اکثریتی علاقے حق خود اختیاری حاصل کر کے اغیار کی دست برد سے محفوظ ہو جائیں اور علامتی طور پر ملک کی وحدت بھی برقرار رہے۔ منصوبے کے خدوخال ذہن میں واضح ہونے کے بعد انھوں نے کانگریس کمیٹی کابل کے تحت "مہا بھارت سرو راجیہ پارٹی" قائم کی جس کے ذریعے وہ منصوبے کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرنا چاہتے تھے۔

مولانا نے اپنے پروگرام کا ابتدائی مسودہ تیار کیا جو دسمبر ۱۹۲۳ء میں مکمل ہوا۔ وہ حقیقت میں ان کے شخصی خیالات پر مبنی تھا (بحوالہ مولانا عبید اللہ سندھی کے سیاسی مکتوبات: صفحہ ۵۸)۔ اسے حتمی شکل دینے کے لیے انھوں نے ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں اور اپنے قابل اعتماد رفقا سے صلاح مشورہ جاری رکھا۔ ان کے رفقا میں عزیز احمد، اقبال شیدائی، ظفر حسن اور تیجا سنگھ آزاد خاص اہمیت رکھتے تھے۔ ظفر حسن ان دنوں ماسکو میں مقیم تھے۔ عزیز احمد کے ذریعے انھیں پروگرام کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو انھیں بعض حصوں میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی، چناں چہ وہ بعجلت ۵۔ اگست ۱۹۲۴ء کو ماسکو سے روانہ ہو کر ۱۰۔ اگست کو استنبول پہنچے۔ ان کے اور مولانا کے درمیان ہر روز تبادلہ خیالات ہوتا۔ بالآخر پروگرام کو مکمل کر لیا گیا۔ اس بارے میں مولانا نے لکھا ہے:

> "اس سال جس قدر تفصیل و توضیح سے خیالات مرتب کیے ہیں اس میں ظفر حسن بھی پورے طور پر شریک رہا ہے ...... اور جس قدر ہندوستانی قابل مشورہ ملتے رہے، ان کی رائے بھی شامل کر لی گئی۔ اس لیے اسے صحیح معنی میں کانگریس کمیٹی کے نام سے نسبت ہو سکتی ہے۔"
>
> (مولانا عبید اللہ سندھی کے سیاسی مکتوبات: حوالہ مذکورہ: صفحہ ۵۸)

غالباً ابتدائی مسودہ وہی ہے جسے رسالہ تاریخ و سیاست نے فروری ۱۹۵۴ء کے شمارے میں وضاحتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس میں لکھا گیا ہے:

"ذیل میں، ہم آزاد ہندوستان کے سیاسی آئین کا وہ خاکہ شائع کرتے ہیں جو مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے ۱۹۲۲ء میں مرتب کیا تھا۔ وہ اس وقت کابل سے روس ہوتے ہوئے ترکی پہنچے تھے اور عصمت پاشا وغیرہ کمالی اکابر کو بتانا چاہتے تھے کہ حصول آزادی اور انقلاب حکومت کے بعد ہندوستان کے مسلمان آزاد اور فعال قوم کی طرح رہ سکیں گے۔ اس غرض سے مرحوم کسی وحدانی یا مرکزی حکومت کے بجائے برعظیم کو مختلف آزاد ممالک میں تقسیم کرنا اور صرف سیاسی اتحاد کے ذریعہ متحد رکھنا چاہتے تھے ان کے "سفر نامہ، کابل" اور ذاتی سوانح میں بھی، جو علاحدہ چھپ کر شائع ہو چکے ہیں، صاف صاف تحریر ہے کہ وہ مسلمانوں کے ہندوستان میں محض ایک اقلیت رہ جانے پر قانع نہیں اور تحریک خلافت کے بعد تک جو مسلم سیاسی اکابر کانگریس کے زیر اثر آگئے ان کی مذمت کرتے ہیں۔ (دیکھو "ذاتی ڈائری"، سفر نامہ، کابل، ص ۹۶) مرحوم کا یہ منصوبہ قسطنطنیہ میں انگریزی اور اردو میں طبع ہوا تھا، لیکن مدت سے نایاب ہے۔ ہمیں مولانا کے عزیز قریب اور رفیق طریق مولوی عزیز احمد صاحب نے جو آج کل کراچی میں مقیم ہیں، مہربانی سے یہ قلمی مسودہ دیا اور چوں کہ یہ نہ صرف مولانا مرحوم کی انقلاب پسندی اور سیاسی فراست کی دستاویز ہے بلکہ ہمارے افکار میں ارتقا کی اب ایک تاریخی شہادت بن گیا ہے ہم نے اسے رسالہ تاریخ میں از سر نو چھاپ دینا مناسب سمجھا۔"

(رسالہ تاریخ و سیاسیات، کراچی۔ فروری ۱۹۵۴ء: صفحہ ۱۱)

[اس نوٹ میں ادارہ کی جانب سے چند امور حقیقت کے برخلاف ہیں۔ یہ امر خلاف واقعہ ہے کہ ۱۹۲۲ء میں مولانا نے مسودہ اس وقت تیار کیا جب وہ کابل سے روس ہوتے ہوئے ترکی پہنچے تھے۔ یہ خواندگی کا سہو ہے یا کتابت کی غلطی۔

مولانا وسط جولائی ۱۹۲۳ء میں ترکی پہنچے تھے۔ ترکی جانے کا جو مقصد بیان کیا گیا ہے وہ بھی درست نہیں۔]

پروگرام کو آخری شکل دینے کے بعد استنبول کے "محمود بے مطبع" میں ۱۹۲۴ء

میں چھپوایا گیا۔ اس کا عنوان ہے:

"نیشنل کانگریس میں تحریک آزادی کا دوسرا دور

یعنی

کانگریس کمیٹی کابل کا سرو راجیہ پروگرام

اور

مہا بھارت سرو راجیہ پارٹی کا پروگرام"

مطبوعہ کتابچے بذریعہ ڈاک کثیر تعداد میں ہندوستان بھجوائے گئے لیکن بحری سنسر نے اسے ضبط کر لیا اور حکومت وقت نے کتابچے اور اس کے ترجمے کے داخلہ پر پابندی عائد کر دی۔ ظفر حسن نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے چھپوایا۔ اس میں ایسی تبدیلیاں کی گئیں کہ ضبطی کے قانون کا اطلاق نہ ہو سکے۔

مطبوعہ اردو کتابچہ نایاب اور عدم دستیاب ہے، البتہ انگریزی ترجمے کا عکس سندھ یونی ورسٹی سے ایک ریسرچ اسکالر نے ڈاکٹر شیخ محمد حاجن نے اپنے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے میں شامل کیا ہے۔

ہمارے زیر نظر رسالہ "تاریخ و سیاسیات" کے مذکورہ شمارے میں مطبوعہ اردو پروگرام، ظفر حسن کی "آپ بیتی" میں اس کا تعارف اور پی ایچ۔ ڈی کے مقالے میں شامل انگریزی میں پروگرام ہیں۔

(۲)

مجوزہ پروگرام:

مولانا سندھی نے "سرو راجیہ پارٹی" کا جو پروگرام تجویز کیا تھا وہ ان کے اور ان کے رفقا کے وسیع مطالعے، تاریخ کے تجزیے اور حالات کے جائزہ کے مطابق اس نوعیت کا تھا جس سے برصغیر کے تمام مسائل حل ہو سکتے تھے۔ ملک میں پائے جانے

والے مذہبی، لسانی، نسلی، طبقہ واری اختلافات کی نوعیت سے وہ بخوبی واقف تھے۔ سیاسی افکار اور تحریکات کی سطحیت ان کے لیے سوہان روح تھی۔ اسلام کے احیا مسلمانوں کی بقا اور ان کے حقوق کے تحفظ کا انھیں خیال تھا۔ انھوں نے مسائل کے حل کے لیے جہاں اسلام سے رہنمائی حاصل کی، وہیں انقلاباتِ زمانہ کے تجربات سے بھی سبق حاصل کیا۔ ماسکو میں قیام کے دوران سوشلسٹ نظام کے عملی رواج اور اس کے نتائج گویا ان کی آنکھوں دیکھے تھے۔ انھوں نے انقلاب کے ہمہ جہت مطالعے کے لیے کابل کمیٹی کے چند اراکین کو روسی زبان سیکھنے اور براہِ راست معلومات حاصل کرنے کا حکم دیا تھا اور خود بھی اہم شخصیات سے تبادلہء خیالات کیا تھا۔ یورپ کے ممالک پر انقلابِ روس کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے کمیٹی کے اراکین کو مختلف ممالک کے دورے کروائے تھے۔ ترکی میں قیام کے دوران میں تمام تجربات، مشاہدات، مطالعے اور افکار کا جائزہ لے کر برصغیر کے مسائل کے حل کے لیے غور و فکر کا انھیں موقع ملا۔ ان تمام صبر آزما مراحل سے گزر کر وہ ایک پروگرام مرتب کرنے میں کامیاب ہوئے، جس میں ان کے چند صاحبِ بصیرت ساتھیوں کی آرا بھی شامل ہیں۔

پروگرام پانچ ابواب پر منقسم ہے۔ ابتدا میں ایک دیباچہ بھی ہے جس میں مسائل اور تنازعات کی نشان دہی کی ہے۔ مسلمانوں کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور اپنے بیانات کی تائید میں مولانا الطاف حسین حالی کے مسدس کے بعض حصے بھی درج کیے ہیں۔ "سرمایہ دار" کے زیرِ عنوان سات بند، "محنت کش" کے زیرِ عنوان سات بند اور "محنت کش انسانوں سے ہمدردی" کے زیرِ عنوان ۶ بند دیے گئے ہیں۔ اسی حصے میں "مہا بھارت سرور اجیہ پارٹی" کا تعارف اور "سرور اجیہ تحریک" کی ضرورت کو بھی واضح کیا ہے۔

سرور اجیہ پارٹی کا پروگرام پانچ ابواب اور ۴۰ دفعات پر مشتمل ہے۔ اکثر دفعات کے ضمنی دفعات بھی ہیں۔ ابواب کی تفصیل حسب ذیل ہے؛

پہلا باب: پارٹی پروگرام اور اصول

دوسرا باب: تنظیم، ہندوستان کی تقسیم، پارٹی کا مرکز اور اس کے میدان عمل، مقننہ اور انتظامیہ کی تفصیل۔

تیسرا باب: سروراجیہ جمہوریتوں کے بنیادی اصول، سیاسی اور معاشی، مذہبی امور کے بارے میں اصول۔

چوتھا باب: انڈین فیڈرل سروراجیہ ری پبلکن اسٹیٹ (وفاق ہند)

پانچواں باب: سروراجیہ ایشیاٹک فیڈریشن

سروراجیہ پارٹی کا سیاسی پروگرام ان بنیادی اصولوں پر بنایا گیا تھا۔

باب اول کے دفعہ ۲-الف میں یہ مقصد قرار دیا گیا ہے:

"ہندوستان کے لیے کامل آزادی حاصل کرنا، جمہوری طرز کی حکومت قائم کرنا، ان تمام کوششوں کو مسترد کرنا جو فی زمانہ ہندوستان کی "وحدتِ قومی" قائم کرنے کے لیے کی جارہی ہیں"۔

تاریخی شواہد اور اس دور کے حالات نے ثابت کر دیا تھا کہ اقوام ہند کے مذہبی، لسانی، معاشرتی اور علاقائی اختلافات کو ختم کر کے انھیں واحد قوم بنانے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ نہ تو ہندو بہ زعم اکثریت مسلمانوں کو حقوق دینے پر آمادہ تھے اور نہ مسلمان علامتی قومی اتحاد کی خاطر انھیں قربان کرنے پر آمادہ تھے۔ اس بارے میں جتنی کوششیں ہندوؤں نے کیں اس سے کہیں زیادہ مصالحانہ رویہ مسلمانوں نے اختیار کیا، جن کا کبھی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ اس بنیادی نوعیت کے اختلاف کی وجہ سے ملک بدامنی، انتشار اور خون خرابے میں مبتلا تھا جو آزادی کی منزل کو دور کرنے کے ساتھ دائمی امن وامان کے قیام میں مزاحم تھا۔ اس کے امکانات بھی تھے کہ بعض علاقوں میں بغاوت اور مرکز سے لاتعلقی کے اقدام ہوں، اس لیے آزادی اور جمہوریت کی سعی کرتے ہوئے اس بات کو ذہن سے نکال دینا ضروری تھا کہ ملک

میں "قومی وحدت" ہے یا ہو سکتی ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی ایک بیدار مغز صاحب بصیرت شخص تھے۔ ان میں تاریخ کی رو کو سمجھنے کا بالغ شعور تھا۔ انھوں نے حقیقت کو تسلیم کیا اور اپنے پروگرام کے بنیادی اصولوں اور مقاصد میں اسے شامل کیا۔

پروگرام کا ایک نکتہ ملک کی اکثریت یعنی محنت کش طبقے کے بارے میں تھا جو خالص اسلامی اصولوں پر استوار کیا گیا۔ اس وقت ملک نہایت غریب تصور کیا جاتا تھا کیوں کہ ۹۹ فی صد سے زائد افراد جو زرعی، صنعتی، تجارتی یا ذہنی محنت کش تھے، مفلوک الحال زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی اکثریت ساہوکاروں کے قرضوں کے نیچے پشتہا پشت سے دبی ہوئی تھی اور اس سے نکلنے کا کوئی ذریعہ ان کے پاس نہیں تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں قوم کے معمار تھے، ملک کے بہی خواہ تھے۔ وہ خون پسینہ بہا کر بھی دو وقت کی روٹی کے لیے محتاج تھے۔ انھیں سیاسی حقوق کبھی نہیں دیے گئے۔ سرمایہ دارانہ، زمیندارانہ اور استحصالی نظام میں ان کی خیر خواہی کا دم بھر کر خاص مفادات رکھنے والے ہی ان کی نمائندگی کا دم بھرتے، لیکن وہ خود سیاسی نمائندگی سے محروم رہے مولانا سندھی نے باب اول دفعہ ۲۔ب میں انھیں محنت کشوں کو جہادِ آزادی کا ہراول دستہ قرار دیا ہے۔ اس کے لیے سرمایہ داری اور سامراجی نظاموں کو ختم کرنے کا اعادہ کیا ہے، تاکہ مساوات کی بنیاد پر ایسا معاشرہ قائم ہو جو عالم انسانیت کے لیے نمونہ ہو۔ دفعہ ۱۱۔ب۔۱ میں انھوں نے سرور اجیہ پارٹی کی یہ ذمہ داری قبول کی ہے کہ وہ محنت کش طبقے کے تمام افراد کے قرضہ ادا کرے گی اور اس کام کی منصوبہ بندی کر کے اسے قابل عمل بھی بنا دیا ہے۔ ان کے سیاسی حقوق کے بارے میں پارٹی کے پروگرام میں یہ منصوبہ بھی شامل کیا گیا ہے کہ پارٹی ملک میں سرور اجیہ جمہوریت کے اہم ترین مقصد کے لیے کام کرتے ہوئے محنت کشوں کی سیاسی تربیت بھی کرے گی اور ان کی ایسی تنظیمیں قائم کرے گی جن کو انتظامی معاملات میں ان کے اراکین کی تعداد کے تناسب سے مکمل دخل حاصل رہے۔ دفعہ ۱۸ کے ذریعے کسانوں اور محنت کشوں کو

انجمن سازی کے ناقابل تنسیخ (irrevocable) حقوق دیے گئے ہیں اور پیشہ ورانہ تنظیم کی منظوری سے ہڑتال کے حق کو بھی ناقابل تنسیخ قرار دیا ہے۔ مولانا سندھی کا پورا پروگرام آزادی اور مساوی حقوق پر مبنی ہے۔ محنت کش طبقوں کے حقوق کے بارے میں کسی سیاسی جماعت نے نہ تو اس قدر واضح پروگرام کبھی بنایا اور نہ ان کے بارے میں یقین دہانی کروائی۔

پروگرام کی اگلی دفعہ میں اقوام ہند کو باہم مربوط رکھنے کے لیے انڈین فیڈریشن (وفاق ہند) کی تشکیل کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس کی وضاحت باب اول دفعہ ۳ اور باب سوم کی تمام دفعات میں کی گئی ہے۔

ہندوستان کا رقبہ پورے یورپ (بہ اخراج روس) کے برابر ہے۔ ایسے وسیع ملک میں ثقافت، زبان، معاشرت، رسم ورواج اور اندازِ فکر کی وجہ سے اختلاف کا ہونا ضروری ہے، اس لیے پارٹی نے کسی بھی "غیر فطری" اتحاد پر انحصار کرنے سے گریز کیا اور نہ ایسے اتحاد کو آزادی کے لیے لازمی شرط کے لیے قبول کیا۔ باب دوم میں انھیں حالات کے تحت ملک کی ہیئتِ ترکیبی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس میں ملک کے تین جغرافیائی خطے قرار دیے گئے ہیں۔ (۱) شمال مغربی، (۲) شمال مشرقی اور (۳) جنوبی سروراجیہ پارٹی نے سیاسی مقاصد کے لیے ان فطری خطوں کو ایسے ریجن (region) قرار دیا کہ ہر ایک میں متعدد "ممالک" (ریاستیں) شامل ہوں۔ ان "ممالک" کی تفصیل دفعہ ۶ میں، اس طرح درج ہے:

i ... بھارت: اس کی عمومی زبان ہندوستانی یا اردو ہے۔ اور اس میں دہلی، آگرہ، لکھنو جیسے شہر آباد ہیں۔ دوآبہ گنگا و جمنا اسی میں شامل ہیں۔

ii ... جنوب مشرقی پنجاب: عمومی زبان پنجابی اور امرتسر اس کا مرکزی شہر۔

iii ... شمالی پنجاب: پوٹھوہاری اور پنجابی عمومی زبان اور راولپنڈی مرکزی شہر۔

iv ... جنوب مغربی پنجاب: بشمول بہاول پور، ملتانی پنجابی عمومی زبان اور ملتان

مرکزی شہر۔

(لاہور ان پنجابی جمہوریتوں سے باہر رہے گا)۔

v ـــ کشمیر: کشمیری عمومی زبان اور سرینگر مرکزی شہر۔

vi ـــ پشتونیہ: پشتو عمومی زبان اور پشاور مرکزی شہر۔

vii ـــ بلوچستان: بلوچی عمومی زبان، کوئٹہ اور قلات اس کے اہم شہر۔

viii ـــ سندھ: سندھی عمومی زبان، کراچی اس کا مرکزی شہر۔

ix ـــ گجرات: گجراتی عمومی زبان، احمد آباد مرکزی شہر۔

x ـــ راجپوتانہ: ہندوستانی ہندی عمومی زبان، اجمیر مرکزی شہر۔

(اس ہیئتِ ترکیبی میں آسام اور بنگال کو جگہ نہیں دی گئی۔)

یہ "سرو راجیہ ممالک" باہمی رضامندی سے "سرو راجیہ جمہوریت" قائم کر سکیں گے اور اپنی معاشی، ثقافتی اور سیاسی شناخت کو باقی رکھتے ہوئے فیڈرل ری پبلک آف انڈیا" کی اکائی (Unit) بن سکیں۔ اس طرح جو صورتِ حال سامنے آتی ہے اسے "وفاقوں کا وفاق" یا کنفیڈریشن کہنا ہی درست ہو گا لیکن پروگرام میں اسے "وفاق ہی کہا گیا ہے۔ دفعہ ۳۲ب میں کشمیر، شمالی پنجاب، جنوب مغربی پنجاب، جنوب مشرقی پنجاب، پشتانیہ، بلوچستان اور سندھ کے اشتراک سے ایک ایسی سرو راجیہ جمہوریت کا تصور پیش کیا گیا ہے جس کی عمومی زبان اردو اور صدر مقام لاہور ہوتا۔ اسی طرح بھارت، راجپوتانہ اور گجرات کے اشتراک سے قائم ہونے والی جمہوریت کی زبان ہندوستانی (ہندی / اردو) اور آگرہ اس کا صدر مقام ہوتا۔

مرکز میں ان سب کو نمائندگی دی گئی ہے، جو معاشی، ثقافتی اور فوجی اہمیت کی بنیاد پر مقرر کی جائے گی۔

ہر جمہوریت کا مذہب اس کی اکثریت کے مذہب کے مطابق ہوتا ہے لیکن وفاق کا نہ کوئی مذہب ہوتا اور نہ وہ کسی جمہوریت کے مذہب میں مداخلت کی مجاز ہوتا

وفاق کے اختیارات کو دفاع، امورِ خارجہ کی حد تک محدود رکھا گیا ہے۔

ہر جمہوری ملک کی پنچایت یعنی پارلیمنٹ کو تمام مالی، قانونی اور عدالتی اختیارات حاصل ہوں گے، جن کے اراکین کے انتخاب بالغ رائے دہی کی اساس پر نہیں بلکہ سماجی اور معاشی طبقوں کی بنیاد پر ہوں گے۔ مروجہ جمہوریتوں کے طرزِ عمل میں "ایک فرد ایک ووٹ" کا اصول رائج ہے۔ جاری طریق عمل سے کئی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ حلقہ انتخاب وسیع ہوتے ہیں، ہر گوشے تک وہی رسائی حاصل کر سکتا ہے جو زیادہ سے زیادہ سرمایہ خرچ کر سکے۔ انتخابات کے اخراجات عوام کی ہمدردی میں نہیں کیے جاتے، اسے کاروبار بنا لیا گیا ہے اور عام رجحان یہ ہے کہ جتنا خرچ کرو منتخب ہونے کے بعد اس کا دس بیس گنا حاصل کر لو۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ انتخاب سرمایہ داروں، زمینداروں اور اہل ثروت کا کھیل بن گیا ہے۔ محنت کش طبقہ نہ اس میں حصہ لے سکتا ہے اور نہ اس کے مفادات کی خاطر خواہ نمائندگی ہو سکتی ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کی پیش بینی نے پیدا ہونے والی اس صورتِ حال کو ۱۹۲۴ء ہی میں بھانپ لیا تھا اس لیے سرو راجیہ پارٹی کے پروگرام میں نمائندگی کا حق پیشہ ورانہ افراد کے تناسب سے انھیں کی سبھاؤں اور انجمنوں کے ذریعے مقرر کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ملک میں جسمانی اور ذہنی محنت کرنے والوں کی تعداد سرمایہ داروں، زمینداروں اور اہل ثروت تاجروں سے بہت زیادہ ہے۔ اس لیے ایوان نمائندگان (پنچایت) میں انھیں کا غلبہ ہوتا اور چوں کہ وہی مسائل کا حقیقی ادراک رکھتے ہیں اور جذبہ، ہمدردی و خدمت سے سرشار ہوتے ہیں، اس لیے وہ مجموعی خوشحالی اور ترقی کے لیے زیادہ موثر ہو سکتے ہیں۔

وفاقی نظام کا مروجہ طریقہ یہ ہے کہ اس کی ہر اکائی اور مرکز دو ایوانی ہوتے ہیں، جیسے بھارت میں اگر اکائی میں دو ایوان نہ بھی ہوں تو مرکز میں ضرور دو ایوان ہوتے ہیں۔ جیسے پاکستان، امریکہ اور برطانیہ وغیرہ میں ہیں۔ سرو راجیہ پارٹی کے پروگرام میں اس جانب توجہ نہیں کی گئی ہے۔

اس منصوبے کے تحت ہر "ملک" کامل اندرونی خود مختاری کا حامل قرار دیا گیا ہے۔ دراصل یہی عمل تمام پیچیدگیوں، الجھنوں سے نجات کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ آزادی کے بعد بھارت اور پاکستان میں ترقی، خوشحالی، امن وامان کو جس طرح تہس نہس کر دیا ہے، اس کی اہم ترین وجہ مرکز (وفاق) کی اختیارات کی ہوس ہے۔ اسی بنا پر دو عملی رائج ہے اور اخراجات میں غیر ضروری اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اسی لیے منصوبے میں کہا گیا کہ:

"ہر سوراجی جمہوریت اپنی معاشی، ثقافتی، سیاسی آزادی قائم رکھتے ہوئے "انڈین فیڈرل سوراجیہ ری پبلکن اسٹیٹ" کا خود مختار رکن رہے گا۔"
(دفعہ ۳۲)

سوراجیہ کے پارٹی پروگرام کا ایک حصہ مجوزہ اصلاحات بالخصوص معاشی اصلاحات کے بارے میں ہے جو اسلام اور سوشل ازم سے متاثر اور مقامی حالات کے مطابق ہے۔ اس میں یہ اہم امور بیان کیے گئے ہیں۔

۱۔ فوائد عامہ کے تمام ذرائع قومی ملکیت میں لینا (دفعہ ۲۰)

۲۔ انفرادی ملکیت (منقولہ اور غیر منقولہ) کی ایک حد مقرر کرنا، اس سے زائد کو قومی ملکیت میں لینا۔ (دفعہ ۲۱)

۳۔ تمام زمین کو قومی ملکیت قرار دینا، زمینداری نظام کا خاتمہ دفعہ ۲۲۔ اس میں مزید وضاحت کی گئی ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی غالب اور موثر اکثریت ہے وہاں فاروق اعظم اور امام ابو حنیفہ کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق مزارعت جاری رکھنا اور زمیندار کو حکومت کا صرف ایجنٹ قرار دینا۔

۴۔ سودی کاروبار کو ممنوع قرار دینا، محنت کشوں کے ساتھ قرضوں کی ادائیگی کا انتظام کرنا اور ضرورت مندوں کے لیے بلاسودی قرضوں کی فراہمی کا انتظام کرنا۔ (دفعہ ۲۳)

۵۔ قومیائے گئے صنعتی یونٹوں کو محنت کشوں کی انجمنوں کے ذریعے چلانا۔ (دفعہ ۲۵)

۶۔ مفت تعلیم اور طبی امداد کا بندوبست کرنا۔

سروراجیہ پارٹی کے سیاسی اور معاشی پروگرام کی طرح "ایشیاٹک فیڈریشن" کا وسیع المقاصد پروگرام بھی بے حد اہم ہے۔ یہ مقام حیرت ہے کہ اس صدی کے ربع اول میں ہی جب کہ عالمی دانشور اور مفکر بھی بین الاقوامیت کے تصور سے عاری تھے، دیوبند کے پڑھے ہوئے ایک مولوی عبید اللہ سندھی نے محسوس کر لیا تھا کہ آنے والے زمانے میں قومیت کے شعور میں بیداری کے ساتھ یہ احساس بھی جاگے گا کہ کوئی ملک یا قوم اپنے دائرہ عمل کو محدود رکھتے ہوئے نہ تو آزادی برقرار رکھ سکتی ہے اور نہ زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ترقی کر سکتی ہے۔ ان کی پیش بینی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ایشیائی ممالک کے وسیع تر اتحاد کا خیال "سروراجیہ ایشیاٹک فیڈریشن" کی صورت میں پیش کیا۔

پانچویں باب میں دفعہ ۳۶ کے ضمن میں انھوں نے وضاحت کی ہے کہ:

"سروراجیہ پارٹی کو یقین ہے کہ آزاد ہند میں اس وقت تک کوئی طرز حکومت کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک ایشیائی اقوام اس سسٹم کو قبول نہ کر لیں۔ اس لیے ضروری قرار پاتا ہے کہ ایشیائی عوام مخالفت سامراجی اور مخالف سرمایہ داری محاذ کی خاطر ایک وفاق بنالیں۔"

پروگرام کے تحت ایشیا کے تمام ممالک اس وفاق میں بھی شریک ہو سکتے ہیں اور چوں کہ اس وقت روس کو بھی مخالف سامراجی اور مخالف سرمایہ داری قوت سمجھا جاتا تھا، اس لیے اس کے رکن بننے کو بھی پسند کیا گیا۔ ان کے علاوہ غیر ایشیائی، کم ترقی یافتہ ممالک مثلاً مصر، مراکش وغیرہ کی رکنیت کے امکانات بھی باقی رکھے گئے۔ اس وفاق میں شرکت کے لیے ضروری نہ تھا کہ ممالک جمہوری ہوں بلکہ ایسے ممالک کے لیے جہاں شہنشاہیت قائم تھی اگر وہاں مخالف سامراجی اور مخالف سرمایہ داری پارٹیاں برسر حکومت آجائیں تو اس حالت میں وہ بھی ایشیاٹک فیڈریشن میں شامل ہو

سکتی ہیں۔

بیسویں صدی میں آئے دن ہونے والی سائنسی ترقی، ذرائع ابلاغ کی وسعت اور ذرائع حمل و نقل کی فراوانی کی وجہ سے دنیا سمٹتی جارہی ہے۔ کوئی ملک عالمی حالات سے بے خبر رہ کر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔ داخلی سلامتی کی نسبت بیرونی مداخلت کے امکانات سے باخبر رہنا بھی ضروری ہے۔ آزادی اور قومی اتحاد کے لیے بین الاقوامی رشتوں کی استواری بھی ضروری ہے۔ مولانا سندھی کی بصیرت نے ان باتوں کی اہمیت کو جان کر وسیع المقاصد وفاق کا نظریہ پیش کیا۔ ان کے پروگرام کے دوسرے حصے کامیاب ہوئے ہوں یا نہیں لیکن اتحاد بین الاقوام کے فلسفے کی ضرور پذیرائی ہوئی یہ اور بات ہے کہ ان کے پروگرام کے عین مطابق نہ ہوئی ہو یا ان کے فلسفے کو تسلیم کرتے ہوئے نہ ہوئی ہو۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ جن خطوط پر ان کی فکر ۱۹۲۴ء میں استوار تھی دوسری عالمگیر جنگ کے بعد انھیں خطوط پر دنیا کے تمام ممالک سوچنے لگے۔ پنچ شیلا، سارک، آر سی ڈی، غیر جانبدار ممالک کی کانفرنس، عرب لیگ، اوپک، مسلم ممالک کی سربراہ کانفرنسیں، مسلم ممالک کے وزرائے خارجہ کی کانفرنسیں، ممالکِ یورپ کا معاشی اتحاد، سیٹو، سنٹو سے لے کر لیگ آف نیشنز اور اقوام متحدہ تک کی تشکیل میں مولانا سندھی کی فکر کی روح زندہ نظر آتی ہے۔

(۳)

سیاسی فکر پر پروگرام کے اثرات:

مولانا سندھی نے سرور اجیہ کے آئینی پروگرام سے ساری دنیا کو متعارف کرنے کا اہتمام بڑے پیمانے پر کیا۔ اردو کے علاوہ ترکی اور انگریزی میں اس کی اشاعت ہوئی۔ مولانا کے بیان کے مطابق:

"پروگرام ہندوستان بھی کئی راستوں سے بھیج دیا ہے۔ افغانستان بھی

روس کو بھی دیا ہے، ترکی اور مصری اہل الرائے بھی دیکھ چکے ہیں۔ ایرانیوں کو بھی دیا ہے۔ جاپان بھی دیکھ لے گا۔"

"یہاں کے روسی تائید کرتے ہیں علی ہذا القیاس مصری و ترک احباب، ماسکو سے بھی امید ہے تائید ہوگی۔ مگر ذرا محنت اور مقابلہ کے بعد۔ جاپان بہت مسرت سے قبول کرے گا۔ افغان گورنمنٹ الٹی میٹم سمجھے گی۔ ہندوستان دیکھیں کس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔"

(مولانا عبید اللہ سندھی کے سیاسی مکتوبات: صفحہ ۶۱)

ہندوستان میں اکثریت کا رد عمل جلد سامنے آگیا۔ مولانا کو پہلے سے اس کا اندازہ تھا۔ اقبال شیدائی کے نام ایک خط میں اس بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

"تقسیم ہند سے ہندو ناراض ہوں گے۔ مگر افتراق کی پہل انھوں نے کی۔ سوامی شردھانند، مالوی جی، راجہ مہندر پرتاب علاحدہ ہو گئے۔ ہندو مہاسبھا اور سنگٹھن اسی کا نتیجہ ہے۔ ہم پر کوئی الزام نہیں لگا سکتے اور ہمارے سامنے کوئی چارہ، کار نہیں۔"

(مولانا عبید اللہ سندھی کے سیاسی مکتوبات: صفحہ ۶۰)

جواہر لال نہرو جو سیاسیات کے طالب علم کی حیثیت سے ملکی اور یوروپی صورت حال کے مطالعے میں مصروف تھے، مولانا سندھی سے اس وقت ملاقات کی تھی جب وہ ترکی سے حجاز کا قصد کر کے روانہ ہوئے اور اٹلی میں مختصر قیام کیا تھا۔ اپنی ملاقات کے تاثرات تحریر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

"مجھے وہ ایک نہایت چالاک انسان نظر آئے۔ ان میں سیاسی جوڑ توڑ کی پرانی وضع کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ جدید نظریات سے واقف نہیں تھے۔ انھوں نے "ریاست ہائے متحدہ" یا "متحدہ جمہوریہ ہند" کی ایک اسکیم تیار کی تھی۔ انھوں نے استنبول کی اپنی مصروفیات کا حال بھی بتلایا تھا۔ انھیں میں نے زیادہ اہم خیال نہیں کیا اس لیے میں انھیں بھول گیا۔ چند ماہ بعد ان کی ملاقات لالہ لاجپت رائے سے ہوئی۔ ان کے سامنے بھی وہی کہانی (اسکیم) بیان

کی، انھوں نے غیر منصفانہ اضافوں اور استعجاب آمیز کمی کے ساتھ ہندوستان پہنچ کر دہرائی۔ اس سال کے انڈین کونسل کے انتخابات میں ان کے ان خیالات نے اہم کردار ادا کیا۔"

(Jawehar Lal Nehru, An Autobiograply, John Lane, London. 1936, Page 151.)

سروراجیہ پارٹی کے پروگرام کی انڈین نیشنل کانگریس کی جانب سے کوئی پذیرائی نہیں ہوئی۔ اس سے وابستہ مسلمان راہنماؤں میں سوائے مولانا ابوالکلام آزاد اور دو ایک راہنماؤں کے کسی نے پسند نہیں کیا اور اگر کیا بھی تو اس کا اظہار نہیں ہوا برصغیر کی سیاسی فکر جو ۱۹۲۶ء کے بعد سامنے آئی اس پر پروگرام کے واضح اثرات ملتے ہیں۔ اگرچہ صاحبان فکر نے پروگرام کے خطوط پر اپنے نظریات قائم کیے لیکن کسی نے امر حق کا اظہار بھی ضروری نہ سمجھا۔ مولانا سندھی کے خطوط میں اشارے ضرور ملتے ہیں کہ کن راہنماؤں نے ذہنی طور پر پروگرام کو قبول کر لیا تھا، چناں چہ ایک خط میں وہ اطلاع دیتے ہیں:

"ڈاکٹر اقبال اور فضل حسین پہلے ہی یہ نظریہ قبول کر چکے ہیں۔"

(مولانا ... سندھی کے سیاسی مکتوبات: صفحہ ۶۱)

تعجب ہے کہ اس کے باوجود ظفر حسن نے شک و شبہ کا اظہار کرتے ہوئے "آپ بیتی" میں لکھا ہے:

"ہم نہیں جانتے کہ علامہ موصوف (اقبال) نے یہ پروگرام پڑھا تھا یا نہیں۔ اگر نہ بھی پڑھا ہو اور فرض کیا جائے کہ انھوں نے ۱۹۳۰ء کے ملکی حالات کو مدنظر رکھ کر پاکستان بنانے کی تجویز مستقل طور پر سوچ کر پیش کی تھی تو کم از کم یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ہستی اور تہذیب کو ہندوستان میں محفوظ رکھنے کی تجویز سب سے پہلے قبلہ مولانا صاحب کی طرف سے ۱۹۲۴ء میں اس وقت کے حالات کے مطابق ہندوستانیوں کے سامنے پیش

کی گئی تھی۔

(ظفر حسن: آپ بیتی: صفحہ ۱۱۶)

ایسی واضح شہادت بھی سامنے آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال پروگرام سے بخوبی آگاہ تھے۔ رسالہ "الولی" حیدر آباد سندھ کے ایڈیٹر مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی نے شمارہ اکتوبر ۱۹۷۷ء کے شذرات میں لکھا گیا ہے کہ:

"کئی سال ہوئے ایک مرتبہ ہم نے سندھ مسلم کالج کراچی میں استاد محترم مولانا عبید اللہ سندھی کی یاد میں ایک برسی منائی، جس کی صدارت سندھ کے مشہور صحافی اور دانشور سید (پیر) علی محمد شاہ (راشدی) نے کی اور مہمان خصوصی مولانا عبدالمجید سالک نے تقریر فرمائی۔ لکھے پڑھے اور دانشور لوگوں کا بڑا اجتماع تھا۔ سالک مرحوم نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ مولانا غلام رسول مہر ماضی قدیم (۱۹۲۸ء) میں فریضہ، حج ادا کرنے گئے تھے مکہ، مکرمہ میں ان کی ملاقات علامہ عبید اللہ صاحب سندھی سے ہوئی۔ علامہ سندھی مرحوم نے اپنے پروگرام کی ایک کاپی مہر صاحب کو دی۔ مولانا نے یہ پروگرام استنبول میں بنایا تھا، جس کی خاص بات یہ تھی کہ ہندوستان کو مختلف اقوام کا ملک بتایا گیا تھا اور جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اس کے خصوصی حقوق اور اگر چاہیں تو الگ ہو جائیں کا ذکر تھا۔ مولانا غلام رسول مہر صاحب جب واپس ہوئے تو ڈاکٹر صاحب (علامہ اقبال) سے اس کا ذکر کیا اور وہ کاپی دے دی۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اس پروگرام کو سراہا۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر صاحب کو الٰہ آباد میں یونیٹی کانفرنس کی صدارت کے لیے جانا تھا اور ڈاکٹر صاحب نے وہاں جو خطبہ دیا اس میں سیالکوٹ کے دوسرے عظیم انقلابی اور مفکر علامہ عبید اللہ سندھی کے پروگرام کی بعض اہم باتوں کا بھی ذکر کیا۔ مولانا چوں کہ حکومت کے باغی تصور کیے جاتے تھے، اس لیے ان کا نام نہ لیا۔"

(رسالہ "الولی" حیدر آباد سندھ، اکتوبر ۱۹۷۷ء، صفحہ ۴)

امر واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کا خطبہ، صدارت مسلم لیگ اجلاس ۱۹۳۰ء اسی

پروگرام کا نقش ثانی ہے، اگرچہ ان کا خیال واضح نہیں ہے۔ انھوں نے خطبے میں ارشاد فرمایا تھا کہ:

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ضم کر دیا جائے خواہ یہ مجوزہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرلے، خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اور مربوط اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔"

(فاؤنڈیشن آف پاکستان: صفحہ ۱۵۹)

خطبہ میں "ریاست" کا لفظ غیر واضح ہے۔ ہر وفاق کی اکائی "ریاست" ہی کہلاتی ہے۔ جیسے امریکہ کی ریاستیں! اس لیے دستوری اصلاحات کے لیے تجاویز مرتب کرنے والی "نہرو کمیٹی" میں بھی اسے پیش کیا گیا تھا۔ ایک احتمال یہ ہوتا ہے کہ وہ اس علاقہ کی چار ریاستوں یا صوبوں کو ملا کر مسلمانوں کی وحدت کا تصور پیش کرنا چاہتے تھے اور باقی ہند سے اسے آزاد کرنے کے حامی نہیں تھے۔ اس کی تصدیق ان کے بعض خطوط سے بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے تھامسن کو ۴۔ مارچ ۱۹۳۴ء کو خط لکھا تھا:

"آپ نے مجھے پاکستان اسکیم کا خالق قرار دیا ہے۔ پاکستان اسکیم میری نہیں ہے، میں نے اپنے خطبے میں جو تجویز پیش کی تھی وہ مسلم صوبے کے قیام کی تھی۔ میرا مطلب شمال مغربی ہند میں مسلمانوں کی مکمل اکثریت کے صوبے سے ہے جو ہند کے مجوزہ وفاق کا حصہ ہوگا۔ پاکستان اسکیم میں مسلم صوبوں کا ایسا وفاق تجویز کیا گیا ہے جو ایک جداگانہ ڈومینین کی حیثیت سے براہِ راست برطانیہ سے منسلک ہو۔"

اسی طرح ۶۔ مارچ ۱۹۳۴ء کو انھوں نے راغب احسن کو لکھا تھا:

"براہِ کرم یہ بات بھی نوٹ کرلیں کہ اس تبصرہ کے لکھنے والے (مسٹر تھامسن) میری اسکیم کو پاکستان اسکیم سمجھتے ہیں۔ میں نے تو انڈین فیڈریشن میں ایک مسلم صوبے کے قیام کی تجویز دی ہے جب کہ پاکستان

اسکیم میں شمال مغربی مسلم صوبوں کی ایسی فیڈریشن کی اسکیم رکھی گئی ہے جو انڈین فیڈریشن سے باہر ہو اور براہِ راست برطانیہ سے منسلک ہو۔"

(اقبال --- جہان دیگر، مرتبہ محمد فرید الحق، کراچی - ۱۹۸۳ء صفحہ ۱۱۵-۱۱۴)

خطبہ، صدارت میں لفظ "ریاست" استعمال کیا گیا ہے اس سے ان کا جو مطلب تھا وہ ان خطوط سے واضح ہے۔ علامہ نے "حق خود اختیاری" کا حوالہ دے کر مولانا سندھی کی طرح مسلمانوں کی اندرونی آزادی کا مطالبہ کیا ہے اور ہند کی علامتی وحدت باقی رکھنے کے لیے ایک وفاق کا تصور پیش کیا ہے جو صوبوں اور ریاستوں کے داخلی معاملات میں مداخلت نہ کرے۔ مولانا سندھی اور علامہ اقبال کی فکر اس فرق کے باوجود کہ مولانا کئی ریاستوں کا وفاق اور پھر وفاق کا الحاق مرکز (کنفیڈریشن) سے چاہتے تھے جب کہ علامہ ریاستوں کو یکجا کر کے وفاق میں بطور اکائی شامل ہونے کے حق میں تھے، ماننا پڑے گا کہ ان کی اساس ایک ہی تھی مسلمانوں کی آزادی اور ان کے جان و مال اور حقوق کا تحفظ!

علامہ اقبال کے بعد چودھری رحمت علی نے جنوری ۱۹۳۳ء میں مولانا سندھی کے آئینی منصوبے کو آگے بڑھایا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی نظر سے پروگرام گزرا تھا یا نہیں، کیوں کہ اس بارے میں کوئی مستند شہادت موجود نہیں ہے، لیکن انھوں نے اپنے کتابچے Now or Never میں "پاکستان" کے جو خدوخال پیش کیے ہیں اس میں وہ مولانا سندھی کی فکر کی اساس پر کامل آزادی کو شامل کرتے ہیں۔ انھوں نے پنجاب کی تقسیم کو تسلیم نہیں کیا ہے، اسے ایک مکمل اکائی کے طور پر فیڈرل پاکستان کا حصہ قرار دیا ہے۔ مولانا برصغیر کی "علامتی وحدت" کے قائل تھے جب کہ چودھری رحمت علی مکمل آزادی کے خواہاں۔ مسلم لیگ نے اسی اسکیم کو بنیاد بنا کر تحریک چلائی۔ سندھ نے ۱۹۳۸ء میں اس کو مطالبہ کی صورت میں پیش کیا اور ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ نے پاکستان کے منصوبے کی قرارداد کے ذریعے تائید کی

مولانا حسرت موہانی نومبر ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کے رکن بنے تھے۔ ۱۹۳۶ء کے بعد لیگ کی تنظیم نو کے سلسلے میں انھوں نے انتہائی فعال کردار ادا کیا۔ ۱۹۴۰ء میں پاکستان کے حق میں منظور ہونے والی قرارداد کے وہ زبردست حامی تھے۔ اس کے باوجود ان کا ذہن مولانا سندھی کے پروگرام سے متاثر رہا۔ ان کی بھی یہ خواہش تھی کہ برصغیر کی "علامتی وحدت" بقا کے ساتھ مسلم اکثریتی علاقوں میں حقوق خود اختیاری دیے جائیں۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ مولانا حسرت موہانی اندرون ملک اور بیرون ملک ہر اس طاقت سے قریبی ربط رکھتے تھے جو کامل آزادی کے حصول کے لیے کوشاں تھی۔ ان کا رابطہ مولانا برکت اللہ بھوپالی اور ان انقلابیوں سے براہِ راست تھا جو بیرون ملک جدوجہد کو آگے بڑھا رہے تھے۔ رولٹ کمیٹی رپورٹ میں اس کی شہادت موجود ہے، اس لیے یہ باور کرنا حقیقت پر مبنی ہو گا کہ وہ مولانا سندھی کے پروگرام سے پوری طرح واقف تھے۔ پاکستان کے حامی ہونے کے باوجود اس پروگرام کو از سر نو زیادہ تفصیل سے مرتب کر کے اپنے رسالہ "اردوے معلیٰ" بابت جنوری تا مارچ ۱۹۴۲ء میں شائع کیا۔

مولانا سندھی نے برصغیر کو تین علاقوں میں تقسیم کیا تھا جب کہ مولانا حسرت حسب ذیل پانچ علاقوں میں تقسیم کرتے ہیں:

۱۔۔۔ وفاقیہ ہند مشرقی: میں آسام اور بنگال کی جمہوریتیں

۲۔۔۔ وفاقیہ ہند جنوب مشرقی: میں آندھرا، مدراس، سی پی اور اڑیسہ کی جمہوریتیں

۳۔۔۔ وفاقیہ ہند مرکزی: میں بہار، یوپی، مہاراشٹرا کی جمہوریتیں

۴۔۔۔ وفاقیہ ہند جنوب مغربی: بمبئی اور گجرات کی جمہوریتیں

۵۔۔۔ وفاقیہ ہند مغربی: بلوچستان، سرحد، سندھ اور پنجاب کی جمہوریتیں

انھوں نے ان پانچوں وفاقوں کو ایک ترکیبیہ (Confederal) سے

منسلک کیا ہے۔ اس کے عملی پہلوؤں کی وضاحت میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

" وفاقیہ ریاستیں خود مختار ہوں گی اور مابقی معاملات میں ترکیبیہ کی ماتحت نہ ہوں گی۔"

" ہر جمہوریہ و وفاقیہ کے انتخاب میں حق رائے کل آزاد بالغوں کو حاصل رہے گا۔ پارٹیاں صرف سیاسی بن سکیں گی اور یہ شرط لازمی طور پر درج دستور ہوگی کہ اگر ایک رائے بھی صریحاً فرقہ یا مذہب کی بنا پر حاصل کی جائے گی تو بشرط ثبوت وہ انتخاب کالعدم ہو جائے گا۔"

" ترکیبیہ ہند میں بغرض اشتراک عمل ہر وفاقیہ، ہندوستان برابر تعداد میں اپنے نمائندے بذریعہ انتخاب بھیجے گا۔"

" ہر جمہوریہ و وفاقیہ کو اپنا اپنا گورنر یا گورنر جنرل انتخاب کرنے نیز اپنے ایوان ہائے قانون کے انتخاب کا حق ہوگا۔"

" ترکیبیہ کے صدر کا انتخاب براہِ راست کل باشندگان ترکیبیہ کی رائے سے ہوگا اور اس کا عمل مسائل مفوضہ تک محدود رہے گا۔"

" وفاقیہ کے صدر کا انتخاب بھی براہِ راست کل بالغان وفاقیہ کی رائے سے ہوگا اور اس کا دائرہ، عمل مسائل مفوضہ تک محدود رہے گا۔ باقی معاملات میں جمہوریتیں خود مختار ہوں گی وفاقیہ کے ماتحت نہ ہوں گی۔"

چوں کہ یہ خاکہ دوسری عظیم جنگ کے دوران میں پیش کیا گیا تھا، اس رعایت سے انھوں نے تجویز رکھی کہ:

" اگر حکومتِ برطانیہ اس مجوزہ دستور کو منظور اور اس کے فوری قیام کو تسلیم کرلے گی تو موجودہ صوبہ جات ہند کے یوروپین گورنر مجوزہ جمہوریتوں کے گورنر اور ہندوستان کے موجودہ گورنر جنرل ترکیبیہ ہند کے عارضی پریذیڈنٹ مان لیے جائیں گے اور دوران جنگ میں ہندوستان کی کل فوج اور وسائل ان کے اور موجودہ کمانڈر انچیف کے ماتحت کام میں لائے جاسکیں گے۔ البتہ جنگ کے خاتمہ پر اہل ہند باضابطہ طور پر اپنے گورنر اور

کل ہند کا پریذیڈنٹ منتخب کرلیں گے۔"

اسی کے ساتھ انھوں نے ترکیبیہ ، ہند کو حق دیا ہے کہ "ترکیبیہ کو حق ہوگا کہ جن آزاد حکومتوں یا جمہوریتوں مثل برطانیہ ، روس یا چین سے معاہدہ ، دوستی یا غیر جانبداری کرے ، نیز صلح و جنگ کا بھی اعلان کرسکے۔"

دیسی ریاستوں کا مسئلہ بھی ان کے پیش نظر تھا۔ ان کے بارے میں ان کا منصوبہ یہ تھا کہ:

> "ہندوستان کی موجودہ دیسی ریاستوں میں سے جو اور جب ایک وفاقیہ آزاد کا درجہ حاصل کرلیں ، مثلاً حیدرآباد و برار وغیرہ ۔ وہ بھی اس ترکیبیہ نظام میں شامل ہوسکتی ہیں۔"

گویا ہر دیسی ریاست ایک جمہوریہ میں تبدیل ہو جاتی۔

مولانا عبید اللہ سندھی کے مجوزہ آئین کی اس سے بہتر تشریح اور عملی صورت اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی۔

مولانا حسرت موہانی مجوزہ آئینی منصوبے سے ہی متاثر نہیں تھے بلکہ وہ مولانا سندھی کی طرح سیاسی جماعتوں کی مروجہ طرز پر تشکیل و قیام کے بھی حامی نہیں تھے۔ پروگرام میں مولانا سندھی نے پیشہ ورانہ تنظیموں کے قیام کی حمایت کی ہے جب کہ کسی سیاسی جماعت کے قیام کی ضرورت کو کہیں بیان نہیں کیا ہے۔ جہاں تک سیاسی جماعتوں کے طرزِ فکر و عمل کا تعلق ہے ، مولانا حسرت موہانی وسیع تر تجربہ رکھتے تھے۔ ان کی عملی سیاست کی ابتدا کانگریس میں شمولیت سے ہوئی۔ اس سے بیزار ہو کر مسلم لیگ میں آگئے۔ پہلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس بڑی شدومد سے قائم کرکے کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔ اپنی جداسیاسی جماعت بنائی۔ ان تمام تجرباتی عمل سے گزرنے کے بعد انھوں نے یہی رائے قائم کی کہ موجودہ طرز کی سیاسی جماعتوں کے بجائے طبقے اور پیشے کے اعتبار سے جماعتیں قائم ہونی چاہییں جو سیاست میں بھی فعال کردار ادا کر

سکیں، جیسے سرمایہ داروں کی مالدار پارٹی، محنت کشوں کی کامدار پارٹی وغیرہ۔ اپنی سیاسی زندگی کے آخری دور میں انھوں نے تحریکِ پاکستان کی جو حمایت کی وہ اسی وجہ سے تھی کہ نظریہ، پاکستان اور ان کے اپنے نظریہ میں بڑی مطابقت تھی۔

مولانا حسرت موہانی کی طرح مولانا ابو الکلام آزاد بھی آئینی پروگرام کے حامی تھے، جس کی بالواسطہ طور پر خود انھوں نے تصدیق کی ہے۔

۱۹۴۶ء میں حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان کی آزادی اور فرقہ وارانہ اختلافات کے حل کے لیے کابینہ کے اراکین پر مشتمل ایک مشن ہندوستان بھجوایا تھا۔ اس وقت کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مولانا آزاد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ:

"شملہ کانفرنس سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ سیاسی مسئلہ طے ہونے کی نوبت پر پہنچ چکا ہے لیکن فرقہ واری تنازعہ طے ہونا باقی ہے۔"

(India Wins Freedom: Edition 1979, Page 147.)

مولانا اس مسئلے پر مسلسل غور کرتے رہے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں انھیں بحیثیت مسلمان تحفظ کا احساس ہے، البتہ جن صوبوں میں وہ اقلیت میں ہیں عدم تحفظ کے شکار ہیں۔ انھوں نے مولانا سندھی کے پروگرام کے خطوط میں سوچا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان کو ایک وفاق بنانا پڑے گا جس کے اختیارات محدود ہوں اور ہر صوبے کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دے کر ان میں آزادی کا احساس پیدا کرنا ہوگا۔ چناں چہ ان کے ذہن میں اختیارات کی تقسیم کی تین نوعیتیں آئیں:

(۱) لازمی اختیارات جو وفاق کو حاصل ہوں یعنی؛ دفاع، رسل و رسائل اور امورِ خارجہ،

(۲) اختیارات جو صوبے چاہیں تو وفاق کے حوالہ کر دیں،

(۳) اختیارات جو صوبوں کو حاصل ہوں اور جن میں مرکز قطعی مداخلت کا مجاز نہ ہو۔

مولانا آزاد نے یہی تجویز کابینہ مشن کے سامنے ۶۔اپریل ۱۹۴۶ء کو پیش کی جو مشن کے اراکین کو پسند آئی۔ بعد میں ۱۲۔اپریل کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے مشن سے ملاقات کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے اسی کا اعادہ کیا۔ مولانا آزاد کی تجویز کی پوری عمارت مولانا سندھی کے پروگرام کی بنیادوں پر تعمیر ہوئی تھی۔ جسے بعد غور و خوض و ترمیم کے کابینہ مشن نے قبول کر لیا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"The Cabniet Mission plan was in spirit the same as mine and the only addition was the institution of the three sections." Page 157.

مولانا سندھی نے علاقائی بنیادوں پر جس طرح ہندوستان کو تین حصوں میں منقسم کرنے کا تصور پیش کیا تھا، ترمیم کے ساتھ کابینہ مشن نے اپنا پلان اسی کے مطابق بنایا۔ اس نے تین Zones قائم کرنے کی تجویز رکھی؛ ایک پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان پر مشتمل جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، دوسرا آسام اور بنگال ملا کر جہاں مسلمانوں کی معمولی اکثریت تھی اور تیسرا زون باقی ماندہ ہندوستان پر مشتمل تھا۔

مولانا آزاد کے بیان کو غلط ماننے کی کوئی وجہ نہیں اس کی بھی شہادت موجود ہے کہ وہ مولانا سندھی کے پروگرام سے واقف ہو چکے تھے اور اس کی تائید کرتے تھے۔ اسی لیے ماننا پڑے گا کہ یہ روشنی انھوں نے مولانا سندھی کی فکر ہی سے حاصل کی تھی۔

غرض ۱۹۲۴ء کے بعد تمام فرقہ وارانہ اور آئینی مسائل کے جتنے بھی مسلمانوں کے افکار منظر عام پر آئے ان سب کی اساس مولانا عبید اللہ سندھی کے مجوزہ آئین میں ملتی ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

کی خدماتِ سندھ --- ایک سرسری نظر

ڈاکٹر ابو سلمان سندھی

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے، لیکن ان کی قسمت میں روزِ ازل سے اسلام کی سعادت لکھی تھی۔ ان کے بخت کی فیروز مندی نے انھیں اسلام سے متعارف کرایا۔ وہ اسلام کی صداقت و حقانیت کا دل پر نقش لے کر ایک رات کو گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ گھر سے نکل کر وہ سب سے پہلے ضلع مظفر گڑھ کے ایک قصبے کوٹلہ رحم شاہ میں پہنچے۔ چند دن بعد معلوم ہوا کہ ان کے خاندان والے ان کی تلاش و تعاقب میں ہیں تو یہاں سے بھی سفر پر آمادہ ہوئے اور سندھ کا رخ کیا۔ بھرچونڈی (ضلع سکھر) میں حضرت سید العارفین حافظ محمد صدیق علیہ الرحمہ کی خانقاہ اور مرکزِ رشد و ہدایت کی شہرت سندھ سے نکل کر پنجاب اور ہندوستان کے دیار و امصار تک پہنچ چکی تھی۔ حضرت کی ذاتِ قدسی صفات بلا تفریق مذہب و ملت مرجع خلائق تھی۔ مولانا سندھی نے بھی اسی آستانہ فیض کا رخ کیا۔ اگر ان کے لیے کوئی پناہ گاہ ہو سکتی ہے تو یہی آستانہ اور یہی خانقاہ رشد و ہدایت ہو سکتی ہے۔ حضرت سید العارفین نے اس نو مسلم بچے کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا اور ان کی تعلیم و تربیتِ اسلامی پر توجہ فرمائی۔ مولانا فرماتے ہیں:

> "چند ماہ میں ان کی صحبت میں رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت میرے لیے اس طرح طبیعت ثانیہ بن گئی، جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے۔"

ایک روز حضرت نے اپنے مریدین و مسترشدین کے حلقے میں فرمایا:

"عبید اللہ نے اللہ کے لیے، ہم کو اپنا ماں باپ بنایا ہے۔

تقریباً باون برس گزرنے کے بعد مولانا لکھتے ہیں:

"اس کلمہ، مبارکہ کی تاثیر خاص طور پر میرے دل میں محفوظ ہے۔ میں انھیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں اور محض اس لیے سندھ کو وطن بنایا یا بن گیا۔"

مولانا سندھی مرحوم کی زندگی کے اس پہلو میں ہمارے لیے بڑی بصیرت اور سبق ہے۔ ان کے لیے اس سرزمین میں کیا تھا جو ملک کے کسی دوسرے خطے میں میسر نہ آسکتا تھا۔ جب انھوں نے اپنا آبائی گھر چھوڑ دیا تو انھیں کسی ایک جگہ کے مسکن سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ ملک کے جس حصے میں نکل جاتے اور جس قریہ و مصر میں ایک سائبان بنا کر بیٹھ جاتے وہی ان کا وطن بن جاتا۔ وہ اپنے علم و فضل کی پونجی لے کر جدھر بھی نکلتے، عقیدت کیشوں اور نیاز مندوں کا ایک ہجوم ان کے استقبال و پذیرائی کے لیے موجود ہوتا۔ وہ اپنی فکر و نظر کی دکان جہاں بھی لگاتے علم و بصیرت کے طالب پروانوں کی طرح اس شمع پر اپنی جان نچھاور کرتے۔ لیکن اس وفا سرشت نے جب ایک مرتبہ اپنا ہاتھ ایک مربی کے ہاتھ میں دے دیا تو پھر چھڑانا گوارا نہ کیا۔ جس کے سایہ، عاطفت میں انھوں نے زندگی کے چند ماہ گزارے تھے اس کی چوکھٹ سے ترکِ تعلق کا خیال بھی زندگی بھر اس کے دل میں نہ ایا تھا۔ جس محسن نے ان کی غربت و مسافرت کے ایام میں ان کے لیے ایک جائے سکون مہیا کی تھی اور اپنی مربیانہ شفقتوں اور محبتوں سے نوازا تھا ان کی احسان مند طبیعت نے اس محسن کی ذات سے، اس کی اولاد سے، اس کے خلفا سے، اس کے مریدین و مسترشدین سے بلکہ اس کے سنگِ آستاں سے، اس کے قریہ و شہر سے اور اس کے صوبے سے محبت کو اپنا وظیفہ، حیات سمجھ لیا۔ زندگی بھر اس خانوادے سے نسبت اور اپنے سندھی ہونے پر فخر کرتے

رہے پھر یہ فخر محض زبانی نہ تھا۔ اپنے عمل اور اپنی زندگی کے طور طریقوں سے اس کا ثبوت دیا۔ انھوں نے سندھی معاشرت کو اپنایا، یہاں کی وضع و لباس سے محبت کی، سندھی زبان کو بہ ذوق و شوق سیکھا اور اس وقت جب کہ وہ تعلیم سے فراغت پا چکے تھے۔ وہ ملک کے کسی حصے میں نکل جاتے اور اسے اپنا وطن بنا لیتے تو آج سندھ میں کوئی شخص ان کو بے وفائی کا طعنہ نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن وہ وفا سرشت تعلیم ختم کرتے ہی سندھ کی طرف لوٹا اور سب سے پہلے اسی آستانے پر اپنی عقیدتوں کا نذرانہ پیش کیا۔

مولانا سندھی کا میدان عمل ہندوستان کے مشرقی اضلاع سے لے کر وسط ہند اور شمالی مغربی سرحدی صوبے تک پھیلا ہوا تھا لیکن انھوں نے تعلیم و اصلاح اور رشد و ہدایت کا خاص میدان اسی خطے کو اور وادیٔ مہران اور اس کے باسیوں کو بنایا۔ سندھ ان کی جہد و سعی کا سب سے بڑا میدان رہا ہے، انھوں نے سندھ کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیا، یہاں انھوں نے تحریکِ آزادی کو پروان چڑھایا، کاروانِ حریت کو منظم کیا اور جادۂ استقلال پر روانہ کیا۔ وہ پورے ملک میں سندھ کے اسلامی مزاج، سندھ کی تہذیب اور سندھ کی معاشرت کے ترجمان و نمائندہ تھے۔ انھوں نے سندھ میں علوم و معارفِ اسلامیہ سے دلچسپی اور لگن پیدا کی، سندھ میں تعلیم کو فروغ دیا اور جہالت دور کرنے کی تحریک میں حصہ لیا۔ انھوں نے سندھی زبان کو اپنے انقلابی افکار اور اسلامی تحقیقات سے مالا مال کر دیا۔ انھوں نے سندھ میں اسلامی علوم میں تحقیق و مطالعہ کے مراکز قائم کیے، سندھ کو اپنی سیاسی تحریک کے نشو و ارتقا کا میدان اور افکارِ سیاسی کی تجربہ گاہ بنانا چاہا۔ سندھ ان کا مادری وطن نہ تھا بلکہ بنایا ہوا وطن تھا، لیکن جب انھوں نے ایک مرتبہ اسے اپنا وطن زبان سے کہہ دیا اور ذہن سے قبول کر لیا تو پھر اس بات کو کبھی فراموش نہ کیا کہ سندھ ان کا وطن ہے اور ان پر اس کے حقوق ہیں۔ تقریباً چوبیس سال ملک سے باہر رہے اور جلاوطنی کی زندگی گزاری، لیکن وہ جہاں بھی رہے

سندھ سے ان کا رشتہ ہمیشہ برقرار رہا۔ سندھ سے ان کا تعلق ایسا ہی تھا جیسا اسلام سے تھا۔ انھیں ان دونوں نسبتوں میں کوئی تضاد نظر نہ آیا۔ آخر یہ کس کا فیضان نظر اور کس مکتب کی کرامت تھی کہ مولانا مرحوم کی طبیعت میں اتنا بڑا انقلاب آگیا تھا؟

حضرت سید العارفین کی ولایت کے ثبوت سے لیے صرف یہ ایک واقعہ کفایت کرتا ہے۔ ان کے اس ایک جملے نے کہ "عبید اللہ نے اللہ کے لیے ہم کو اپنا ماں باپ بنایا ہے۔" مولانا سندھی کی کس طرح کایا پلٹ کر دی، اس کا اندازہ مولانا مرحوم کی زندگی اور ان کے کارناموں پر نظر ڈالنے سے ہو سکتا ہے۔

مولانا سندھی نسلاً سندھی نہ تھے ان کی قومیت اختیاری تھی لیکن سرزمینِ سندھ سے نسبت کو انھوں نے دل کی گہرائیوں سے قبول کیا تھا۔ اس لیے انھوں نے "سندھی" کے لفظ کو اپنے نام کا جزو بنالیا اور یہ لفظ ان کے نام کے ساتھ ایسا چسپاں ہوا کہ برِ‌عظیم پاک و ہند کے کسی گوشے میں چلے جائیے اور کسی معمولی پڑھے لکھے شخص سے، جسے تاریخ آزادی اور اسلامیات کے مطالعے سے دلچسپی ہو یا عرب و حجاز کا کوئی صاحبِ علم ہو اگر اس سے پوچھا جائے کہ مولانا سندھی سے کون شخصیت مراد ہے تو ہندوستان کے دور دراز قریہ و مصر اور عرب و حجاز کی علمی دنیا میں صرف ایک ہی جواب ہو گا کہ مولانا سندھی سے مراد سندھ کے مشہور عالم دین، مفکر، انقلابی، سیاست داں اور فلسفہ ولی اللہیٰ کے سب سے بڑے شارح مولانا عبید اللہ ہیں۔

سرزمینِ سندھ سے بڑے بڑے اہل علم پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں مفسر ہیں، محدث ہیں، فقیہ ہیں، فلسفی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی ٹھٹھوی ہے، کوئی حیدرآبادی ہے کوئی ہالائی ہے، کوئی جیکب آبادی ہے۔ ان میں سے کوئی لاڑکانہ سے اپنی نسبت رکھتا ہے، کوئی دادو سے، کوئی کراچی کا ہے کوئی سکھر سے اپنے تعلق پر نازاں و فرحاں ہے۔ لیکن "سندھی" کم از کم اس بیسویں صدی میں صرف ایک پیدا ہوا ہے جسے دنیا عبید اللہ کے اسم سامی سے جانتی ہے۔

نسبت کسی شخص سے ہو، خواہ کسی سرزمین سے، خواہ کسی مکتبہ فکر سے، خواہ کسی خاندان یا قبیلے سے ہو، اس نسبت کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور ضروری ہوتا ہے کہ ان تقاضوں کا جواب دیا جائے۔ صرف اس ایک چیز کی روشنی میں انسان کی سیرت کی عظمت یا پستی کا فیصلہ کر دیا جا سکتا ہے۔ مولانا سندھی مرحوم کا پہلا رشتہ حضرت سید العارفین اور ان کے خانوادہ رشد وہدایت سے تھا اور اس کے تعلق سے انھوں نے سندھ کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ مولانا سندھی مرحوم کی شخصیت اور سیرت کا یہ پہلو نہایت نمایاں ہے کہ جب انھوں نے حضرت سید العارفین کو اپنا دینی باپ کہا تو پھر اس خانوادے سے ہمیشہ کے لیے اسی طرح وابستہ ہو گئے جس طرح خاندان کے ایک فرد کو اس سے وابستہ ہو جانا چاہیے تھا۔ حضرت سید العارفین کے وصال کے بعد ان کے خلفا سے بھی اسی عقیدت و نیاز سے ملتے رہے اور اپنے تعلق کو قائم رکھا۔

مولانا سندھی مرحوم نے سندھ سے اپنی محبت کا متعدد مواقع پر اظہار کیا ہے۔ ۱۲۔ جولائی ۱۹۴۰ء ٹھٹھہ ضلع کانگریس کمیٹی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

> "مجھے سندھ سے محبت ہے۔ یہ میرے دینی باپ کا وطن ہے۔ میں نے اسے ۵۰ سال سے اپنا وطن بنایا ہوا ہے۔ اس سرزمین کو سیراب کرنے والے دریا کی ہماری مذہبی کتابوں میں تقدیس کی گئی ہے۔ میں نے اس کے کنارے بچپن سے پرورش پائی ہے۔"
>
> "مجھے اس شہر (ٹھٹھہ) سے محبت ہے۔ اس میں مقدس علما اور عارفین کا بڑا مجمع رہا۔ آخری زمانے میں مخدوم محمد معین کا گھر اسی شہر میں تھا، وہ شاہ عبداللطیف کے ہم صحبت بزرگ تھے اور انھوں نے ہمارے امام ولی اللہ دہلوی سے استفادہ کیا تھا۔ اس طرح یہ شہر ہماری حکمت کا ابتدائی معدن ہے۔"

تعجب ہے کہ آج اگر کوئی شخص اپنے سندھی ہونے پر فخر کرے اور اپنے ذوق و

ہمت کے مطابق سندھ کی تعمیر و ترقی، فلاح و بہبود اور سندھ کے حقوق کے تحفظ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے اور وطنؔ کے استحصال کے خلاف دیوار بننا چاہے تو سمجھا جاتا ہے گویا اس نے اسلام سے انکار کر دیا۔ اسے ملکی سالمیت کے اعلیٰ تصور اور نظریہ پاکستان کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کیا سندھ سے محبت کے اس دعوے کے بعد مولانا سندھی کے اسلام اور ایمان میں شک کیا جا سکتا ہے؟ اگر ہم اس معصیت کا تصور نہیں کر سکتے تو اسی بات کے لیے آج کسی کو کیوں مطعون کیا جا سکتا ہے؟

مولانا سندھی مرحوم نے سندھ سے اپنی محبت کا صرف زبانی اظہار ہی نہیں کیا بلکہ زندگی کے ہر ہر لمحے سے اس کا عملی ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ جب ایک مرتبہ انھوں نے سندھ کو اپنا وطن بنا لیا تو پھر اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کیا کہ وہ ایک سندھی ہیں اور سندھ سے ان کی نسبت کے کچھ تقاضے ہیں، انھوں نے بہ دل و جان اس نسبت کے تقاضوں کو پورا کیا۔

- انھوں نے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ سندھی زبان سیکھی۔
- سندھی معاشرت اختیار کی۔
- سندھی تہذیب میں اپنے آپ کو رنگ لیا اور
- سندھ کی تعمیر و ترقی میں اسی جذبے اور دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا جس جذبے اور دلچسپی کے ساتھ ایک سندھی کو حصہ لینا چاہیے تھا۔
- ابتدائی دور میں مولانا سندھی بھرچونڈی میں صرف چند ماہ مقیم رہے تھے۔ پھر وہ طلبِ علم میں نکل کھڑے ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے ریاست بہاول پور کے مختلف مدارس میں علمائے دین سے حاصل کی۔ اس کے بعد دیوبند کے لیے رختِ سفر باندھا اور ایک مدت تک دیوبند، کانپور، رام پور، گنگوہ اور دہلی میں علومِ اسلامی کی تکمیل کے بعد جنوری ۱۸۸۹ء میں سندھ واپس تشریف لے آئے اور سب سے پہلے اسی آستانہ قدسی اور خانقاہِ رشد و ہدایت پر حاضری دی جو ہجرت الی اللہ کے بعد ان کی پناہ گاہ

بنی تھی اور سب سے پہلے اسی بزرگ ہستی کے مزار پر سلامِ ارادت پیش کرنے کے لیے حاضر ہوئے جس کے سایہ ، عاطفت نے ان کی پہلی مسافرت و غربت میں ان کے لیے جائے امن و راحت مہیا کی تھی۔

مولانا سندھی مرحوم نے ۱۵ تا ۱۶ برس کی عمر میں اپنا آبائی وطن چھوڑ دیا تھا۔ ان کی تعلیم کا سب سے پہلا مرحلہ شمالی ہند اور یوپی کے اضلاع میں طے ہوا تھا۔ وہ چاہتے تو شمالی ہند کے کسی قریہ و شہر کو اپنا وطن بنا سکتے تھے لیکن ان کی وفا سرشت طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ اپنی پہلی جائے پناہ کے حقوق کو نظر انداز کر دیا جائے۔

مولانا سندھی اپنے زمانہ ، طالب علمی سے ذہن و فکر کے اس اعلیٰ مقام پر تھے کہ وہ برصغیر پاک و ہند کے جس خطے میں سکونت کی خواہش کا اظہار فرماتے ، ان کے لیے وہ سب کچھ مہیا کر دیا جاتا جو انہیں سندھ میں میسر تھا۔ لیکن انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کی آرام و آسائش کے مقابلے میں اس سرزمین کے حقوق کو پیشِ نظر رکھا جسے وہ اپنا وطن بنا چکے تھے۔

○ مولانا سندھی مرحوم تعلیم سے فراغت کے بعد سندھ واپس تشریف لائے تو ان کے پیش نظر سندھ کی تعمیر و ترقی کے کاموں میں حصہ لینے اور اپنا حق ادا کرنے کے لیے ایک پروگرام تھا اور ہجرت و جلاوطنی سے پہلے وہ جب تک ملک میں رہے ، سندھ اور اہل سندھ کی خدمت سے ایک لمحے کے لیے غافل نہیں ہوئے اور جب وہ ملک سے باہر گئے تب بھی ان کے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ وہ جس طرح ہندوستانی قومیت رکھتے ہیں اسی طرح ہندوستانی قومیت میں ان کا تعلق سندھ کی سرزمین اور اس کی تہذیب سے ہے۔

○ مولانا سندھی مرحوم نے اپنے پہلے سیاسی پروگرام کے مطابق جو انھیں کے الفاظ میں "اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی" کام شروع کیا اور جماعت بنائی تو اس کا پہلا میدان عمل سندھ تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ان کے اس کام کو پسند فرما کر انھیں چند ہدایات

دیں اور بعض اصلاحات کے بعد اس کا تعلق تحریکِ اتحادِ اسلامی سے جوڑ دیا۔

○ ۱۸۸۹ء میں جب مولانا سندھی شمالی ہند کے تعلیمی سفر سے لوٹے تو آپ نے امروٹ میں اپنے استاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے نام پر ایک مطبع محمود المطابع کے نام سے قائم کیا، جس میں انھوں نے عربی اور سندھی زبان میں بعض قیمتی علمی نوادر کو چھاپ کر انھیں دستبرد زمانہ سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا(۱)۔ اس طرح سندھ کی علمی تاریخ میں انھوں نے بیش بہا اضافہ کر کے سندھ سے اپنی وابستگی کا حق ادا کر دیا۔

○ اس مطبع سے کچھ مدت تک وہ ایک ماہوار رسالہ "ہدایت الاخوان" کے نام سے نکالتے رہے۔ اس طرح انھوں نے صحافت کے ذریعے بھی دینی و سیاسی خدمات انجام دیں۔

مولانا تقریباً دو سال تک علمی نوادر کی طباعت و اشاعت اور صحافت کے ذریعے صوبہ سندھ اور ملک کی خدمت میں مصروف رہے۔

○ اس کے بعد انھوں نے گوٹھ پیر جھنڈا (ضلع حیدرآباد) میں دارالارشاد کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا اور تقریباً آٹھ سال تک علوم و معارفِ اسلامی کے درس و تدریس میں مصروف رہے اور مخصوص طلبہ اور اصحابِ استعداد کو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حکمت اور ان کے فلسفے کے مطابق قرآن حکیم کا درس دیتے رہے۔

○ دارالاشاد کے پہلے دور یعنی مولانا سندھی کی ہجرتِ کابل سے قبل کے فیض یافتگان میں علامہ امید علی محدث سندھی، مفسر عصر مولانا احمد علی لاہوری، قامع البدعت مولانا سید ضیاء الدین صاحب العلم، مولانا عبداللہ لغاری، مولانا شیخ محمد اکرم ہالائی، مفتی عبدالقادر سندھی وغیرہم اور مولانا سید وہب اللہ صاحب العلم کی ہدایت کے مطابق ان کے دادا محدث ابو تراب نے منطق میں سلم العلوم مولانا سندھی سے پڑھی اور حضرت علامہ عبدالکریم کورائی رحمتہ اللہ علیہ نے قرآن میں مولانا سندھی سے

استفادہ کیا تھا۔

دارالارشاد کے دوسرے دور یعنی ۱۹۳۹ء کے بعد جب مولانا سندھی وطن واپس آ گئے تھے، مولانا علی محمد کاکیپوتا، مولانا عبدالحق ربانی، مولانا حافظ محمد خلیل احمد نزیل سندھ، مولانا ابو سعید غلام مصطفیٰ قاسمی (ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ اکیڈمی، مدیر ماہنامہ "الولی" حیدرآباد) وغیرہم نے حضرت مولانا کی خدمت میں زانوے تلمذتہ کیا(۲)۔

ان کے علاوہ مولانا عزیز اللہ جروار شہداد کوٹی، شیخ عبدالمجید امجد سندھی، مولوی نور محمد نور، محمد وارث دل، پیر وہب اللہ شاہ راشدی اور دیگر بہت سے لوگ مولانا سندھی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔

مولانا سندھی مرحوم کے یہ وہ تلامذہ ہیں جنھوں نے سندھ کی علمی، تہذیبی، دینی سیاسی، تاریخ پر اپنے مستقل نقوش چھوڑے ہیں اور دورہ آخر میں ان حضرات نے اپنے کارناموں سے سندھ کی علمی او سیاسی تاریخ کے اوراق کو جگمگا دیا ہے۔ سندھ کی تاریخ میں ان حضرات کا مستقل مقام ہے۔ اگر ان حضرات کے علمی، دینی اور سیاسی کارناموں کو تاریخ سندھ سے نکال لیا جائے تو ایک ایسا خلا پیدا ہو جائے گا جو پر نہیں کیا جاسکتا۔ کیا سندھ کی خدمت کے باب میں مولانا علیہ الرحمتہ کی عظمت اور ان کے شرف کے لیے یہ کوئی معمولی بات ہے کہ انھوں نے سندھ کی تاریخ کو اتنے بہت سے اصحابِ علم و فن اور مجاہدین حریت ایک وقت میں دیے ہیں۔

○ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فلسفے اور علوم و معارف کے مطالعہ و تحقیق کے لیے بیت الحکمت کے نام سے مولانا نے جو ایک ادارہ قائم کیا تھا، اگرچہ اس کا علمی مرکز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں تھا لیکن اس کا عملی مرکز دارالارشاد گوٹھ پیر جھنڈا میں قائم کیا اور پھر اس کے تحت ایک ذیلی مرکز کراچی کے مدرسہ مظہر العلوم، اسلام آباد (محلہ کھڈا) میں قائم کیا، دوسرے مراکز دین پور اور لاہور میں تھے۔ نیز شاہ ولی اللہؒ کے علوم و معارف کے نشر و اشاعت کے لیے بیت الحکمت کے نام سے جو

ادارہ قائم کیا تھا اس کا ایک مرکز کراچی تھا۔

○ آخر دورہ۔ حیات میں جب انھوں نے جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنائی تو اس کا پہلا مرکز کراچی اور پہلا میدان عمل سندھ کو قرار دیا۔

○ محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج سندھ میں قائم کیا تھا۔

○ سندھ ساگر انسٹی ٹیوٹ اور سندھ ساگر اکادمی کا میدان عمل و علم سندھ تھا۔

○ سندھ میں انھوں نے تحریکِ حریت کو پروان چڑھایا اور کاروانِ حریت کو منظم کر کے عملی سیاست کے میدان میں اسے رواں دواں کیا۔

○ سندھ کے صاحبِ استعداد نوجوانوں کی فلسفہ۔ ولی اللہیؒ کے مطابق تعلیم و تربیت کا بیڑہ اٹھایا اور سندھ کو افکار ولی اللہیؒ سے منور کرنے اور اسے خطہ۔ علوم و معارف بنا دینے کی کوشش کی۔

○ سندھی زبان کو دینی علوم و معارف اور انقلابی افکار سے مالا مال کر دیا اور شاہ ولی اللہؒ کے فلسفے کے مطابق علوم و تفسیر قرآن کے سلسلے میں اپنے افادات کے ایک بڑے ذخیرے کو مرتب کروا دیا۔

○ جلاوطنی سے واپسی کے بعد انھوں نے سندھ کو اپنے سیاسی خیالات کی تجربہ گاہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ سندھ میں ان کے اصولوں کے مطابق ایک ایسی حکومت قائم ہو جائے جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے لیے مثالی ثابت ہو۔

○ مولانا علیہ الرحمہ سندھ کو معاشی، سیاسی، تعلیمی، غرض یہ کہ ہر لحاظ سے ایک ایسا خوش حال اور ترقی یافتہ صوبہ دیکھنا چاہتے تھے جو دوسرے صوبوں کے لیے مثال ہو اور اس بات کے لیے وہ صرف خواہش مند ہی نہ تھے، اس کے لیے وہ ایک مستقل پروگرام رکھتے تھے۔ مولانا مرحوم نے یہ پروگرام جلاوطنی سے سندھ واپس آنے کے فوراً بعد بنا لیا تھا اور ۳۔ جون ۱۹۳۹ء کو جمعیتہ علمائے صوبہ بنگال کے خطبہ۔ صدارت میں پیش بھی کر دیا تھا۔ اس کے بعد ۱۲۔ جولائی ۱۹۴۰ء کو ٹھٹھہ ضلع کانگریس کانفرنس کے

خطبہ۔ افتتاحیہ میں اس پروگرام پر روشنی ڈالی۔ اس کے علاوہ متعدد تقریروں اور تحریروں میں اس کی طرف اشارات کیے ہیں۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنے بلند عزائم اور اعلیٰ خیالات سے سندھ کی سیاسی فکری تاریخ کے دامن کو اس درجہ مالا مال کر دیا ہے کہ اگر نوجوان چاہیں تو آزادیٔ افکار اور تعمیرِ وطن کے ایک نئے دور کا آغاز کر سکتے ہیں۔

حواشی

۱.... ڈاکٹر نبی بخش خان صاحب بلوچ لکھتے ہیں "اس سلسلے میں طحاوی کے عقائد (سندھی) اور دو دیگر رسالے چھاپے۔" مجلہ مہران، حیدرآباد ۱۹۵۷ء سوانح نمبر صفحہ ۲۷۲

۲.... مولانا قاسمی صاحب نے اپنے مقالہ مشمولہ "الہام الرحمن فی تفسیر القرآن" میں مذکورہ بالا اصحابِ فضل اور ان کی خدماتِ عظیمہ و جلیلہ کا تذکرہ کیا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

کا انقلابی سیاسی منشور

پروفیسر محمد اسلم

۱۹۱۹ء میں مانٹیگو ۔ چیمسفورڈ اصلاحات نافذ کرتے وقت برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں سے وعدہ کیا تھا کہ دس سال گزرنے کے بعد اس بات کا جائزہ لینے کے لیے کہ یہ اصلاحات کہاں تک کامیاب رہی ہیں اور کس حد تک عوام کی امنگوں پر پورا اتری ہیں، ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا اور پھر اس کی سفارشات کی روشنی میں ان اصلاحات میں رد و بدل کیا جائے گا۔ اس وعدے کے مطابق دس سال ۱۹۲۹ء میں پورے ہونے تھے لیکن برطانوی حکومت نے دو سال قبل ہی ۱۹۲۷ء میں یہ وعدہ ایفا کرنے پر توجہ دی۔ نقادوں نے اس کی ایک وجہ یہ بتائی کہ برطانیہ کے دارالعوام (ہاؤس آف کامنز) کے انتخابات عنقریب ہونے والے تھے اور برسر اقتدار کنزرویٹو پارٹی کو یہ خوف تھا کہ ان انتخابات میں حزبِ مخالف لیبر پارٹی ہندوستان کے مسئلے کو ضرور اٹھائے گی اور اگر ایسا ہوا تو کنزرویٹو پارٹی کی کامیابی کا امکان مخدوش ہو جائے گا۔ ان حالات میں کنزرویٹو پارٹی کے رہنماؤں نے دو سال قبل ہی ۱۹۲۷ء میں سر جان سائمن کی سربراہی میں ایک وفد ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا جو یہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد برطانوی حکومت سے نئی اصلاحات یا پرانی اصلاحات میں ترمیم و اضافے کا مطالبہ کرے گا۔ برطانوی حکومت سے اس موقع پر یہ غلطی ہو گئی کہ اس نے سائمن کمیشن میں تمام انگریز ارکان شامل کر دیے۔ بنا بریں کانگریس اور مسلم لیگ نے اس

وفد کے ساتھ عدم تعاون کا فیصلہ کیا۔ ان دونوں جماعتوں کا یہ کہنا تھا کہ برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کو اس قابل نہیں سمجھا کہ انھیں بھی اس وفد میں شامل کیا جاتا۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے سیاسی مسائل کو سمجھنے کے لیے مقامی نمائندوں کو اس وفد میں شامل کرنا اشد ضروری تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے فیصلے کے مطابق سر جان سائمن اپنے رفقا کے ساتھ جہاں کہیں بھی گیا عوام نے اس کا کالی جھنڈیوں کے ساتھ استقبال کیا اور "سائمن گو بیک" کے نعرے لگائے۔ ان حالات میں سر جان سائمن اپنے مشن میں بری طرح ناکام ہوا۔ اس کی ناکامی پر وزیر امور ہند لارڈ برکن ہیڈ نے یہ اعلان کیا کہ اگر ہندوستانیوں میں انتہائی سیاسی اور آئینی شعور پیدا ہو گیا ہے تو پھر وہ متفقہ طور پر ایک آئینی خاکہ تیار کریں، جس کی روشنی میں برطانوی حکومت ہندوستان میں نیا دستور نافذ کرے۔ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں نے لارڈ برکن ہیڈ کے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ایک کمیٹی تشکیل دی جس کا سربراہ پنڈت موتی لعل نہرو کو نامزد کیا گیا۔ پنڈت جی نے ۱۹۲۸ء میں جو دستوری سفارشات پیش کیں، انھوں نے مسلمانوں کو بے حد مایوس کیا، کیوں کہ پنڈت جی نے ان کے حقوق کو بری طرح پامال کیا تھا۔ اس کے جواب میں قائد اعظم نے (مارچ ۱۹۲۹ء میں) اپنے مشہور چودہ نکات پیش کیے، جن میں انھوں نے برطانوی حکومت سے مسلمانوں کے مذہب، تہذیب وثقافت اور ان کے قائم کردہ اداروں کو تحفظ فراہم کرنے کی ضمانت مانگی۔ اس کے علاوہ انھوں نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھی دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات کے نفاذ کا مطالبہ کیا اور سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی سے الگ کر کے نیا صوبہ بنانے کی بھی سفارش کی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مرکز میں وفاقی طرز حکومت رائج کیا جائے اور وفاقی اسمبلی میں مسلم ارکان کی تعداد کل ارکان کی تعداد کا ۱/۳ ہو۔

اس پس منظر میں ہم امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھی نور اللہ مرقدہ کے اس منشور کا جائزہ لیتے ہیں جو انھوں نے سائمن کمیشن کی آمد پر ۱۹۲۷ء میں شائع کیا تھا

اس منشور کے سرورق کا عکس ان کے ایک مرید اخلاص سرشت ظفر حسن ایبک نے "آپ بیتی" میں شائع کیا ہے۔ اس منشور کو پڑھ کر اس بات کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کے طول و عرض میں طبقہ علما میں ان کے پائے کا کوئی اور سیاستدان نہ تھا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ (المتوفیٰ ۱۹۸۵ء) کو امام انقلاب کی شاگردی پر فخر تھا۔ راقم آثم نے بارہا ان کی زبان فیض ترجمان سے یہ الفاظ سنے کہ حضرت امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ کے بعد ہندوستان میں مولانا سندھیؒ سے زیادہ روشن دماغ عالم پیدا نہیں ہوا۔ اس ملک میں مدارس اور معلمین کی کمی نہ تھی۔ ان میں سے متعدد علمائے کرام نے مدتوں تک جیلوں کو اپنے انفاس طیبہ سے معطر اور وجود مقدسہ سے منور رکھا تھا۔ لیکن جس انداز سے مولانا سندھیؒ سیاست کے پیچ و خم اور دستوری مسائل کو سمجھتے تھے، اس کا عشر عشیر بھی دوسروں کے حصے میں نہیں آیا تھا۔

راقم آثم نے پنڈت موتی لعل نہرو کی دستوری سفارشات کا بغور مطالعہ کیا۔ یہ سفارشات ان کی تنگ نظری کی آئینہ دار ہیں۔ سرحد اور بلوچستان مسلم اکثریت کے صوبے تھے، اگر وہاں اصلاحات نافذ ہو جاتیں تو اس کا فائدہ مسلمانوں کو پہنچتا اور سندھ کی بمبئی پریزیڈنسی سے علاحدگی کی صورت میں بھی مسلمان فائدے میں رہتے، اس لیے پنڈت جی نے اپنی روشن خیالی اور بے تعصبی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود بڑی تنگ نظری اور تعصب کا مظاہرہ کیا۔

قائد اعظم محمد علی جناح کے چودہ نکات بڑی سمجھ بوجھ کے بعد پیش کیے گئے تھے جن کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، لیکن ۱۹۲۴ء میں، پنڈت موتی لعل نہرو کی سفارشات کی اشاعت سے چار سال قبل اور قائد اعظم کے چودہ نکات کے منصہ شہود پر آنے سے ساڑھے چار سال پیشتر مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے جن کی تمام تر تعلیم دینی مدارس میں ہوئی تھی اور جنھوں نے آکسفورڈ و کیمبرج کا صرف نام ہی سنا ہو گا، جنھوں نے کسی لا

کالج کی شکل بھی نہ دیکھی تھی اور بیرسٹر ہونے کا سرخاب کا پر بھی اپنی دستارِ فضیلت پر نہیں سجاتے تھے، ایسا جامع منشور پیش کیا، جو پنڈت جی اور قائد اعظم جیسے ماہر قانون دانوں کی پیش کردہ سفارشات پر سبقت لے گیا۔

پنڈت موتی لعل نہرو نے ۱۹۲۸ء میں برطانیہ سے کامل آزادی کی بجائے ڈومینین اسٹیٹس (نوآبادیاتی درجہ) مانگا تھا۔

اگر پنڈت موتی لعل نہرو کی سفارش مانتے ہوئے انگریز ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس دے دیتے تو کنیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور اس زمانے کے جنوبی افریقہ کی طرح ہندوستان پر بھی ملک معظم جارج پنجم کی حکومت قائم رہتی۔یہاں کے باشندے برطانوی رعایا کہلاتے اور جارج پنجم اور اس کے بعد اس کے جانشین ایک انگریز گورنر جنرل یہاں بھیج دیا کرتے جو بادشاہ کی نیابت کے فرائض انجام دیتا۔ ملک کا حقیقی حکمران جارج پنجم ہوتا اور نوٹوں اور سکوں کے علاوہ ڈاک کے ٹکٹوں پر اس کی شبیہ موجود رہتی۔ کبھی کبھار اس کا ولی عہد دورے پر آتا تو والیان ریاست، امراو جاگیردار، علماے سوٗ اور گدی نشین حضرات اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اسے اپنی وفاداری کا یقین دلاتے۔ گورنر جنرل کچھ اختیارات کابینہ کو منتقل کر دیتا اور بس۔ پنڈت جی کی اس "دانشمندانہ تجویز" کے مقابلے میں بطل حریت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ۱۹۲۴ء میں آزادیِ کامل کا مطالبہ کیا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ انگریز ہندوستان سے اپنی بساط لپیٹ کر انگلستان چلے جائیں اور یہاں "سرو راج" قائم کیا جائے۔ انھوں نے اپنے منشور میں خود ہی "سرو راج" کا ترجمہ "سب کا راج" کیا ہے۔

پنڈت موتی لعل نہرو نے انگریزوں سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ نیا دستور بناتے وقت ہندوستان میں وحدانی طرزِ حکومت قائم کریں۔ ایسے طرزِ حکومت میں تمام تر اختیارات مرکز کے پاس ہوتے ہیں اور صوبوں کے پاس برائے نام اختیارات رہ جاتے ہیں۔ پنڈت جی کے مقابلے میں قائد اعظم نے اپنے چودہ نکات میں یہ سفارش کی تھی کہ

نئے دستور کی اساس وحدانی طرزِ حکومت کی بجائے وفاقی طرزِ حکومت پر رکھی جائے۔ قائد اعظم سے دو سال پہلے مولانا سندھی ہندوستان کے لیے وفاقی طرزِ حکومت کو موزوں قرار دے چکے تھے۔

۱۹۴۶ء میں کابینہ وفد نے اپنی دستوری سفارشات میں ہندوستان کے لیے وفاقی طرزِ حکومت کی سفارش کی اور یہ کہا کہ وفاق کے پاس صرف دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات کے شعبے ہوں باقی تمام محکمے صوبوں کو دے دیے جائیں۔ اس سے بائیس سال پہلے ۱۹۲۴ء میں مولانا سندھیؒ نے اپنے منشور میں یہ فرمایا تھا کہ وفاقی حکومت کے پاس صرف امورِ خارجہ، دفاع اور ایکسپورٹ امپورٹ کے محکمے ہوں، باقی تمام امور وفاق میں شامل صوبوں کو سونپ دیے جائیں۔ کابینہ وفد نے مولانا سندھیؒ کا منشور اپناتے ہوئے صرف اتنی سی ترمیم کی کہ ایکسپورٹ امپورٹ کی بجائے مواصلات کا شعبہ وفاق کو دینے کی سفارش کی اور ایکسپورٹ امپورٹ کو صوبوں پر چھوڑ دیا۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ۱۹۲۴ء میں اپنے منشور میں یہ تحریر فرمایا تھا کہ ان کی سرو راجیہ پارٹی ہندوستان کو ایک ملک تصور نہیں کرے گی اور نہ ہی ہندوستان میں متحدہ قومیت کا تصور پیش کرنے کی کوشش کرے گی۔ وہ متحدہ قومیت کو حصول آزادی کی اساس نہیں سمجھے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا ہندوستان میں ایک سے زائد مملکتوں کے قائل تھے اور وہ متحدہ قومیت کی بجائے ہندوؤں اور مسلمانوں میں واضح تمیز روا رکھتے تھے اور انھیں دو قومیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۱۹ء میں کابل میں قیام کے دوران میں مذہبی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم کا نظریہ پیش کیا تھا۔ یہی تصور علامہ محمد اقبال نے ۱۹۳۰ء میں خطبہ الہ آباد میں پیش کیا تھا۔

اوپر حضرت مولانا سندھیؒ اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ ان کی جماعت ہندوستان کو ایک ملک تصور نہیں کرتی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ جغرافیائی لحاظ سے ہندوستان کے تین قدرتی حصے ہیں:

۱۔ شمال مغربی حصہ: جس میں صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان ہیں بلکہ مولانا نے اس میں کشمیر کو بھی شامل کیا ہے۔

۲۔ مشرقی حصہ: جو بنگال اور آسام پر مشتمل ہے۔

۳۔ جنوبی ہند: جس میں ہندو اکثریت کے صوبے مدراس، بمبئی، اڑیسہ اور سی پی شامل ہیں۔ مولانا سندھیؒ نے یوپی اور بہار کے ہندو اکثریت کے صوبے بھی اسی جنوبی بلاک میں شامل کر دیے ہیں۔

۱۹۴۶ء میں جب کابینہ وفد ہندوستان کا سیاسی بحران حل کرنے کی غرض سے یہاں آیا، تو کابینہ وفد نے کہا کہ صوبوں کے تین گروپ بنالیں اور ان کی تفصیل یوں ہوگی:

گروپ الف: ہندو اکثریت کے صوبے ۔۔۔ یوپی، بہار، اڑیسہ، بمبئی، مدراس اور سی پی۔

گروپ ب: شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریت کے صوبے ۔۔۔ سرحد، پنجاب اور سندھ۔ (کابینہ وفد نے بلوچستان اور کشمیر کا نام حذف کر دیا تھا)

گروپ ج: مشرقی ہندوستان کے مسلم اکثریت کے صوبے ۔۔۔ بنگال اور آسام۔ یہ تینوں گروپ اپنی اپنی جگہ آزاد ہوں اور یہ مل کر ایک وفاق میں شامل ہو جائیں۔ وفاقی حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمائندوں کی تعداد مساوی ہو۔ جب راقم آثم نے کابینہ وفد کا منصوبہ دیکھا تو مجھے اس پر بڑی حیرت ہوئی کہ وزیر تجارت سر اسٹیفورڈ کرپس، وزیر بحریہ سر اے۔ وی الیگزینڈر اور وزیر امورِ ہند لارڈ پیتھک لارنس بالکل وہی منصوبہ پیش کر رہے ہیں جو بائیس سال قبل ایک بوریہ نشین عالم دین نے ہندوستان کے سیاسی مسائل کے مستقل حل کے لیے پیش کیا تھا، بلکہ مولانا کا یہ منصوبہ کابینہ وفد کے منصوبے سے کئی لحاظ سے بہتر تھا۔ مولانا سندھی فرماتے تھے کہ ہر گروپ کا سرکاری مذہب وہاں کی آبادی کی اکثریت کا مذہب قرار دیا جائے لیکن وفاقی حکومت بالکل سیکولر اور غیر جانب دار رہے، اسے مذہبی معاملات میں مداخلت کا حق

صرف اسی صورت میں دیا جائے جب مذہب پارٹی کے اقتصادی نظام یا اجتماعی اصولوں کے خلاف ہو۔

مذہب کے معاملے میں مولانا سندھی بڑے بے تعصب تھے۔ ان کے قلب میں بادشاہی مسجد لاہور کے صحن سے کہیں زیادہ وسعت تھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ایک مسلم ملک میں بسنے والے مسلمان کسی غیر مسلم ملک سے برسرپیکار ہوں اور مسلم ملک میں رہنے والا ایک غیر مسلم، مسلمانوں کی حمایت میں لڑتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دے، تو اس کے احکام کفر تبدیل ہو جائیں گے۔ اسی طرح ایک غیر مسلم، ایک مسلم خاتون کی عزت و عصمت بچاتے ہوئے اوباش مسلمانوں کے ہاتھوں مارا جائے تو اس صورت میں بھی اس کے احکام کفر بدل جائیں گے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے آج سے نصف صدی پہلے کیا تھا۔ کیا آج ہمارے درمیان کوئی ایسا وسیع القلب مفتی موجود ہے، جو ان کے فتوے کی توثیق کر دے؟

آمدم برسر مطلب! بات یہ ہو رہی تھی کہ مولانا عبید اللہ سندھی کی سوچ کابینہ وفد کے ارکان کی مجموعی سوچ سے کہیں بڑھ کر تھی۔ کابینہ وفد نے آبادی کے تناسب سے ہر دس لاکھ باشندوں کا ایک نمائندہ مرکزی اسمبلی میں بھیجنے کی تجویز پیش کی تھی۔ مولانا سندھیؒ، علامہ اقبال کے الفاظ میں بندوں کو گننے کے بجائے تولنے کے قائل تھے وہ یہ فرماتے تھے کہ یہ تینوں گروپ مرکزی اسمبلی میں اپنی آبادی کے تناسب کے علاوہ اپنے اقتصادی وسائل، تمدنی برتری اور فوجی اہمیت کی اساس پر اپنے نمائندے بھیجیں ان کی یہ تجویز کابینہ وفد کی تجویز پر اس لحاظ سے فوقیت رکھتی ہے کہ کابینہ وفد نے صرف بندوں کو گنا تھا، تولا نہیں تھا۔ ایک دور افتادہ پس ماندہ علاقہ جس کی آبادی خانہ بدوشوں پر مشتمل ہو، جو تہذیب و تمدن اور تعلیمی اعتبار سے اپنے ہم وطنوں سے صدیوں پیچھے ہوں، جن کے معاشی وسائل صرف ان کے اہل خانہ کی کفالت ہی مشکل سے کرتے ہوں، وہ فوج میں بھرتی نہ دیتے ہوں اور سیاست کی ابجد سے بھی واقف نہ

ہوں، ان کو ان لوگوں کے مقابلے میں جو شہری زندگی کے خوگر ہونے کے ساتھ تہذیب و تمدن اور تعلیم میں بہت آگے ہوں، وہ سیاسی شعور رکھتے ہوں، ان کے معاشی وسائل فاضل ہوں اور وہ حکومت کو ٹیکس دے کر ملک کا نظم و نسق چلانے کے قابل بناتے ہوں، وہ فوج میں بھرتی ہو کر ملکی دفاع کا فریضہ انجام دیتے ہوں۔ مولانا سندھیؒ ان دونوں گروہوں کو اسمبلی میں مساوی نمائندگی دینے کے حق میں نہیں تھے۔ کم از کم اسمبلی میں بیٹھنے اور دستور تیار کرنے کے لیے کچھ تو تعلیمی، تہذیبی، تمدنی اور معاشی پس منظر اور معیار مدِ نظر رکھنا چاہیے۔

ایشیاٹک فیڈریشن

مولانا سندھیؒ نے ۱۹۲۴ء میں ایشیاٹک فیڈریشن کا تصور پیش کیا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ ایشیا کے تمام ملک ایک سیاسی پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں اور باہمی تعاون سے سامراجی قوتوں (برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ) کو ایشیا سے نکال دیں۔ اس زمانے میں انڈونیشیا، فلپائن، ہند چینی (موجودہ ویتنام)، ہانگ کانگ، لاؤس، کمبوچیا، برما، ملایا، سابھ، سراوق، برونائی، ہندوستان، نیپال، بھوٹان، سکم، سری لنکا، عرب امارات، عراق، شام، لبنان، اردن، فلسطین، بحرین، قطر اور مسقط انگریزوں، فرانسیسیوں اور ڈچوں کے قبضے میں تھے۔ افغانستان اور ایران بھی انگریزوں اور روسیوں کے زیرِ اثر تھے مولانا سندھیؒ کی یہ خواہش تھی کہ یہ تمام ملک ایک سیاسی پلیٹ فارم پر جمع ہو کر سامراجی قوتوں سے آزادی حاصل کریں۔ اس ضمن میں اگر روس کو بھی اس فیڈریشن میں شامل کرنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں، وہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکلنے میں ہندوستانیوں کی مدد کر سکتا ہے۔ مزید پیش بندی کے طور پر مولانا نے فرمایا کہ آزادی کے بعد روس کو ہندوستان کے داخلی یا خارجی امور میں مداخلت کا حق نہیں ہوگا۔

آج علاقائی تعاون اور متنازعہ مسائل کے حل کے لیے آر۔ سی۔ ڈی، سارک،

اوپیک، غیر جانب دار ملکوں کی تنظیم، مسلم امہ اور عرب لیگ کام کر رہی ہیں، بلکہ یورپین ممالک نے اقتصادی تعاون کے لیے مشترکہ منڈی قائم کر لی ہے۔ اس سے قبل نیٹو، سیٹو اور وارسا پیکٹ میں شریک کیمونسٹ ممالک کی تنظیمیں بڑا کام کر چکی ہیں، لیکن سب تنظیمیں موجودہ صدی کے نصف آخر میں قائم ہوئیں اور مولانا سندھی ۱۹۲۴ء میں ایشیائی ملکوں کی فیڈریشن قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ ان کی پارٹی کے رکن کا معیارِ زندگی ایک عام کسان کے معیارِ زندگی سے بلند نہیں ہوگا۔ مولانا عوام و خواص میں تفاوت ختم کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ایک بار ڈاکٹر ذاکر حسین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عمارات اور اساتذہ کے رہائشی مکانات غریبوں کے دیہاتوں کے درمیان ایک جزیرے کی طرح واقع ہیں۔ اس طرح معیارِ زندگی میں بڑا تفاوت نظر آتا ہے۔ اگر کبھی ملکی حالات خراب ہوئے تو سب سے پہلے یہی فاقہ کش دیہاتی جامعہ ملیہ پر ہلہ بولیں گے۔

غریب اور امیر کے اس تفاوت کو ختم کرنے کے لیے مولانا سندھی نے فرمایا کہ ان کی پارٹی کے رکن اپنی ضرورت سے زیادہ آمدنی اور فاضل جائداد پارٹی کو دے دیں گے۔ راقم آثم مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو کیمونسٹ سمجھنے والے حضرات سے یہ سوال کرتا ہے کہ ان کا یہ منشور کیا قرآن حکیم کی اس آیت کے عین مطابق نہیں ہے: یسئلونک ماذاینفقون۔ قل العفو ○ (البقرہ: ۲۱۹)

اگر مولانا سندھی کے منشور کی یہ شق اسلامی تعلیمات کے خلاف اور کیمونزم کے حق میں جاتی ہے تو مولانا ضرور کیمونسٹ ہوں گے جو اپنی پارٹی کے ارکان سے یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنی فاضل جائداد اور فالتو آمدنی پارٹی کو دے دیں۔

مولانا سندھی کے منشور میں ایک شق یہ بھی رکھی گئی تھی کہ ان کی پارٹی ملک سے زمیندارہ نظام اور سرمایہ داری کا مکمل طور پر خاتمہ کرے گی۔ اس کی وجہ بتاتے

ہوئے موصوف فرماتے ہیں کہ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ کیمونسٹ سادہ لوح عوام کو کیمونزم کے سبز باغ دکھا کر دھوکا نہ دے سکیں۔ مولانا سندھیؒ نے روس میں قیام کے دوران میں کیمونزم کا بہت ہی قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ جس زمانے میں (۲۳-۱۹۲۲ء) مولانا سندھیؒ روس میں تھے اس زمانے میں کیمونسٹوں کے دو گروپوں میں خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ مولانا نے یہ بھی ملاحظہ فرمایا کہ کیمونسٹوں نے زار روس کو پروپیگنڈے کے ذریعے ختم کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور پھر لینن اور اس کے ساتھیوں نے روس میں زار سے بھی بڑھ کر استبدادی نظام قائم کیا اور عوام جو پہلے زار کے غلام تھے اب کیمونسٹ رجیم (Regime) کے اس سے بھی بدتر غلام ہو گئے۔ مولانا کیمونزم کو قریب سے دیکھ کر اسے دھوکے کی ٹٹی سمجھنے لگے تھے اور ان کا اسلام کے معاشی اور سماجی نظام پر ایمان مزید پختہ ہو گیا اور وہ اسی میں انسانیت کی نجات سمجھنے لگے تھے۔ جو لوگ حضرتِ سندھی کو بڑی جسارت اور بے باکی کے ساتھ کیمونسٹ لکھتے ہیں وہ بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

زمینداره نظام کا خاتمہ

مولانا سندھیؒ زمینداره نظام کو ختم کرنے کے حق میں تھے۔ اس کی یہ رائے تھی کہ زمینیں قومی ملکیت قرار دی جائیں، اس طرح سے موجودہ استبدادی زمینداره نظام ختم ہو جائے گا۔ اس کے حق میں وہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فیصلے اور امام اعظم حضرت ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ تعالیٰ کے فتوے سے استدلال کرتے تھے۔ مولانا سندھی کے منشور میں یہ شق شامل تھی کہ زمینداروں کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے مطابق زمینوں کی ملکیت چھوڑنے پر مجبور کیا جائے گا اور حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے فتوے کے مطابق مزارعت ختم کر دی جائے گی۔ ایک کاشتکار کے پاس صرف اتنی زمین رہنے دی جائے گی جس پر وہ خود

کاشت کر سکے۔

مولانا سندھیؒ کی اس تجویز کے مطابق ایوب خان نے اپنے دورِ اقتدار میں زرعی اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی لیکن زمینداروں نے اس کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے "عوامی اصلاحات" کے نام پر زمین کی حد ملکیت مقرر کرنے کی کوشش کی تو زمینداروں نے اپنی زمینیں اپنے اہل و عیال کے علاوہ اپنے موروثی ملازمین کے نام منتقل کر دیں اور جو تھوڑی بہت سیم زدہ، ناکارہ اور بنجر زمین کسی دوسرے کے نام پر منتقل نہ ہو سکی، وہ حکومت کے حوالے کر دی کہ اسے "مستحقین" میں تقسیم کر دے۔ لاہور کے گرد و نواح میں موضع نیاز بیگ اور علی رضا آباد میں ذوالجناح کے نام بہت سی اراضی وقف ہے جس سے اس کے مصارف اور خدام کی تنخواہیں ادا کی جاتی ہیں۔ اسی طرح چالاک زمینداروں نے، جو خود ہی اسمبلیوں میں بیٹھے ہوئے تھے، ایوب خان اور بھٹو کی زرعی اصلاحات ناکام بنا دیں۔ آج بھی غریب کاشتکار بڑے زمینداروں کی "رعایا" کہلاتے ہیں اور مالکان بھٹہ اپنے مزدوروں کو خرکاروں کی طرح باقاعدہ قید کر کے رکھتے ہیں اور ان سے بیگار لیتے ہیں۔ لیکن بڑے زمینداروں اور بھٹہ مالکان کے خلاف کوئی لب کشائی نہیں کر سکتا کیوں کہ یہی اسمبلیوں میں بیٹھ کر قانون سازی کر رہے ہیں۔

صنعتی کارخانے

مولانا سندھیؒ فرماتے تھے کہ ان کی پارٹی برسرِ اقتدار آ کر تمام کارخانے قومی ملکیت میں لے لے گی۔ (آج صنعت کاروں نے سیاست میں جو گندگی پھیلائی ہوئی ہے مولانا سندھیؒ کے نزدیک صنعتوں کو قومیانا ہی اس کا بہترین حل تھا)۔ مولانا فرماتے تھے کہ قومیائے گئے کارخانے مزدوروں کی انجمنیں چلائیں گی اور انھیں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے صلے میں منافع میں سے "بونس" ادا کیا جائے گا۔ اگر

مولانا کے منصوبے کے مطابق انھیں منافع میں سے حصہ دیا جائے تو لوگ دل لگا کر کام کریں اور پیداوار بڑھ جائیں ۔ مولانا کی سرو راجیہ پارٹی مزدوروں کو رہنے کے لیے صاف ستھرے مکان اور مفت طبی امداد فراہم کرنے کی پابند تھی اور ان کے بچوں کو مڈل تک مفت تعلیم دلانے کی ضمانت دیتی تھی (۱۹۴۴ء میں مڈل کا معیار بہت اونچا تھا

تجارت

اسی طرح مولانا تجارت کو بھی باہمی تعاون سے کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ذریعے چلانے کے حق میں تھے ۔ البتہ وہ سوداگروں کو یہ حق دیتے تھے کہ چاہیں تو وہ ان کوآپریٹو سوسائٹیوں کے رکن بن جائیں اور سال کے اختتام پر انھیں ان کے شیئرز پر دوسرے حصے داروں کے مساوی منافع مل جائے ۔ اس طرح سے تجارت چند ہاتھوں میں مرکوز ہو کر نہیں رہ جائے گی اور کوآپریٹو سوسائٹی ایک طرح سے "وقف" کی صورت اختیار کر لے گی، جس کا مالک کوئی نہیں ہوگا لیکن منافع میں حصہ دار شریک ہوں گے ۔ جہاں تک ایکسپورٹ امپورٹ کا تعلق ہے یہ کام حکومت خود کرے گی ۔

سودی کاروبار

مولانا سندھیؒ ، سودی نظام کو ظلم و استبداد ہی کی ایک صورت سمجھتے تھے ۔ غریب اور محنت کش عوام شادی بیاہ کے موقعوں پر فضول رسم و رواج پورے کرنے اور برادری میں اپنی ناک رکھنے کی خاطر ساہوکاروں سے بڑی بڑی رقمیں قرض لے لیتے تھے اور پھر اس رقم پر سود ادا کرتے کرتے ، ان کی کئی کئی پشتیں گزر جاتی تھیں اور اصل رقم پھر بھی ان کے ذمے ہوتی تھی ۔ مولانا سندھیؒ نے اپنے منشور میں یہ تحریر فرمایا کہ ان کی پارٹی برسر اقتدار آکر سودی کاروبار بالکل ختم کر دے گی اور محنت کشوں کے پرانے

قرضے بے باق کر دے گی۔ یہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجتہ الوداع کی صدائے بازگشت تھی جس میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ آج سے تمام سود باطل ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں۔

آج ۱۹۹۴ء میں اسلامی نظریاتی کونسل، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اور وفاقی شریعت کورٹ کی موجودگی میں بھی ہم جمہوریہ اسلامیہ پاکستان سے سودی نظام اور بنکنگ کا پرانا سسٹم ختم نہیں کر سکے۔ ہم نے سود کا نام "نفع ونقصان میں شراکت" رکھ کر اپنے نفس کو "مطمئن" کر لیا ہے اور شرح سود کو ڈھائی فیصد کم کر کے زکوۃ سے تعبیر کر دیا ہے۔

مناسب نمائندگی

مولانا سندھیؒ کے منشور میں ایک شق یہ بھی رکھی گئی تھی کہ ان کی جماعت ہندوستان میں محنت کش طبقہ (کسان، مزدور اور دماغی کام کرنے والوں) کی اکثریت رکھنے والی حکومت قائم کرے گی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ملک کے ۸۰ فیصد عوام کاشتکار تھے لیکن ان کا ایک بھی نمائندہ اسمبلی میں نہیں ہوتا تھا۔ ان کے ووٹ وڈیرہ یا زمیندار حاصل کر کے اسمبلی میں پہنچ جاتا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسمبلی میں جا کر وہ اپنے ووٹروں کے مفاد کی بجائے اپنے ذاتی مفاد کی حفاظت کرتا تھا۔ ہمارے ہاں آئے دن اخبارات میں ایسے بیانات چھپتے رہتے ہیں کہ ملک کے بائیس لاکھ کلرک قلم چھوڑ ہڑتال کریں گے یا اپنے مطالبات منوانے کے لیے احتجاجی مظاہرے میں حصہ لیں گے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان بائیس لاکھ کلرکوں کا کوئی نمائندہ قومی یا صوبائی اسمبلیوں میں موجود نہیں ہے۔ یہی حال مزدوروں، دکانداروں اور اہل حرفہ کا ہے۔ مولانا سندھیؒ فرماتے تھے کہ یہ طبقے اپنے ہی طبقے سے اپنے نمائندے منتخب کریں جو اسمبلی میں جا کر ان کے مفادات کی حفاظت کریں۔ جب تک ان کے اپنے

نمائندے اسمبلیوں میں نہیں جائیں گے، ان کے حقوق یونہی پامال ہوتے رہیں گے۔ مولانا فرماتے تھے کہ تعداد کے اعتبار سے سرمایہ دار، زمیندار اور وڈیرے ملک کی آبادی میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ لیکن اسمبلیوں میں یہی عوام کے نمائندے بن کر جاتے ہیں۔ یہ اپنے طبقے کے نمائندے تو ہو سکتے ہیں، کسانوں، مزدوروں اور دماغی کام کرنے والوں کی نمائندگی کے حقدار نہیں ہیں۔ اس لیے ملک میں ان کی آبادی کے تناسب سے جو تین چار نشستیں ان کے حصے میں آتی ہیں وہ انھیں دے دی جائیں۔ جب تک پس ماندہ اور غریب طبقوں کے نمائندے اسمبلیوں میں نہیں جائیں گے، ان طبقوں کے نہ تو مسائل حل ہوں گے اور نہ ہی ان کی حالت بہتر ہو گی۔ اگر بروقت اس مسئلے کا حل تلاش نہ کیا گیا تو یہ ملک میں بہت بڑے خونی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہو گا۔

یہاں مولانا سندھیؒ کی فراست کی داد نہ دینا، بڑی ناانصافی ہو گی۔ آج ہمارے ہاں اسمبلیوں کے انتخابات میں ایک امیدوار کا خرچ کروڑوں روپے تک ہو گیا ہے اور اس کا یہ نتیجہ نکلے گا اور نکلا ہے کہ صرف ارب پتی اور کروڑ پتی صنعت کار اور زمین دار ہی اسمبلیوں میں نمائندے بن کر بیٹھیں گے اور ملک کی آبادی کا سب سے بڑا طبقہ کسان، مزدور، کلرک اور چھوٹے دوکاندار صحیح نمائندگی سے محروم رہیں گے۔ مولانا سندھیؒ نے ایسے امیروں پر پچاس فیصد ٹیکس لگانے کی تجویز پیش کی تھی، جیسا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عمرو بن العاص سے نصف جائداد بیت المال کے لیے لے لی تھی۔

شاہ ولی اللہ اور مولانا سندھیؒ

مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تصانیف کا بالاستیعاب مطالعہ مکہ مکرمہ میں قیام کے زمانے میں کیا تھا اور انھوں نے یہ منشور مکہ مکرمہ جانے سے قبل یعنی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خیالاتِ عالیہ سے

مستفید ہونے سے پہلے ہی تیار کر لیا تھا، اس کے باوجود ان کے خیالات میں کس قدر ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ کارل مارکس کی ولادت سے ایک صدی پہلے شاہ صاحب نے جس طرح سے کاشتکاروں، محنت کشوں، اہل حرفہ، سپاہیوں اور عوام کے مسائل پر قلم اٹھایا ہے، کارل مارکس شاہ صاحب کی گردِ پا کو بھی نہیں پہنچ سکا۔ اس کے نظریات نے زار کے استبدادی نظام کی جگہ کمیونزم کے نام سے دوسرا استبدادی نظام قائم کر دیا جو بالآخر دم توڑ گیا۔

حرفِ آخر

آج اس ملک میں اتنی بڑی تعداد میں سیاسی اور دینی جماعتیں موجود ہیں کہ ان کی تعداد انگلیوں کے پوروں پر نہیں گنی جاسکتی۔ پھر ایک ایک جماعت کے کئی کئی گروپ ہیں، لیکن کسی جماعت کے پاس کوئی پر کشش منشور نہیں ہے۔ آج کے "نام نہاد ترقی یافتہ دور" میں اگر مولانا سندھیؒ کے ۱۹۲۴ء میں پیش کردہ منشور کا مطالعہ کیا جائے تو اسے ملاحظہ کر کے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے سیاسی رہنما آج اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی جو باتیں کر رہے ہیں، حضرت سندھیؒ ۱۹۲۴ء ہی میں اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے لیے منشور تیار کر چکے تھے۔

حضرت مولانا کی برسی یا برسیاں منانے کے بجائے اگر ان کے منشور پر عمل کیا جائے تو ان کی روح کو اس سے بڑی تسکین ملے گی اور وہ یہ کہہ سکیں گے کہ ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

کے بارے میں

پروفیسر محمد سرور جامعی کی تالیفات

مولانا محمد اسحاق بھٹی

۱۹۳۹ء میں ممتاز اہل حدیث عالم مولانا عطاء اللہ حنیف فیروزپور میں مقیم تھے میری عمر اس وقت تیرہ چودہ سال کی تھی اور میں ان سے عربی کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ ایک دن پتا چلا کہ مولانا عبید اللہ سندھی "فتوحی والا" میں تشریف لائے ہیں اور دو دن وہاں قیام فرمائیں گے۔

فیروزپور سے بذریعہ سڑک (یعنی فیروزپور روڈ سے) لاہور کو آئیں تو چار میل کے فاصلے پر دریائے ستلج کا ہیڈ حسینی والا آئے گا۔ اس سے تین میل اور آگے بڑھیں تو اسی سڑک کی بائیں جانب فتوحی والا نظر آئے گا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں اس زمانے میں یہ ضلع لاہور کی تحصیل قصور میں واقع تھا اب قصور کو ضلع بنا دیا گیا ہے، لہٰذا یہ گاؤں اب ضلع قصور میں ہے۔

اس گاؤں کی تمام آبادی مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہاں ایک شخص صوفی ولی محمد رہتے تھے جو نہایت نیک اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ ان کے متعلق بہت سی عجیب و غریب کرامات قسم کی باتیں مشہور تھیں، جن کے تذکرے کی یہاں ضرورت نہیں۔ ان کا تعلق کسی زمانے میں چمرقند کی جماعت مجاہدین سے رہا تھا۔ مسلکاً اہل حدیث تھے۔ ان کی ایک بیٹی کی شادی مولانا عبید اللہ

سندھی کے ایک بھتیجے سے ہوئی تھی۔ اس رشتے کے علاوہ بھی مولانا سندھی اور صوفی ولی محمد کے باہم گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ مولانا سندھی کی ہندوستان آمد سے قبل صوفی ولی محمد وفات پا گئے تھے۔ اب مولانا سندھی طویل مدت کے بعد واردِ ہند ہوئے اور لاہور تشریف لائے تو اپنے پرانے دوست اور سمدھی صوفی ولی محمد کے گاؤں فتوحی والا کو بھی شرف قدوم سے نوازا۔

انگریز دشمنی کی وجہ سے ملک کے سیاسی اور مذہبی حلقوں میں مولانا سندھی کی بڑی شہرت تھی اور لوگ نہایت احترام سے ان کا نام لیتے تھے۔ فتوحی والا میں ان کی آمد کی اطلاع پا کر فیروز پور سے جن حضرات نے ان سے سلام و زیارت کے لیے وہاں جانے کا عزم کیا وہ تھے مولانا عطاء اللہ حنیف، مولانا عبید اللہ احرار، خان عبدالعظیم خاں، حکیم احمد علی اور مہر محمد علی۔ یہ حضرات تانگے پر بیٹھ گئے تو مولانا عبید اللہ احرار نے مجھے بھی تانگے پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا، چناں چہ میں بھی ان بزرگوں کے ساتھ فتوحی والے چلا گیا۔ مولانا سندھی مسجد میں تشریف فرما تھے جو صوفی ولی محمد کے مکان سے ملحق تھی۔ پانچ چھ آدمی وہاں بیٹھے تھے جن سے مولانا باتیں کر رہے تھے۔ ہم مسجد میں گئے اور مولانا کو سلام کیا تو انھوں نے کھڑے ہو کر سب سے مصافحہ کیا۔ گورا رنگ، سفید لمبی ڈاڑھی، ننگا سر اور اس پر اتنے چھوٹے چھوٹے سفید بال دیکھ کر کچھ احساس ہوتا تھا کہ دو یا تین دن پہلے باریک مشین یا استرے سے سر منڈایا ہو گا۔ لمبا سفید کھدر کا کرتہ اور سفید کھدر کی پاجامہ نما سی شلوار۔ تیکھے نقش اور چمک دار آنکھیں، میانہ قد۔ یہ تھا مولانا سندھی کا حلیہ اور لباس۔ ان کی سائڈ پاکٹ میں سفید کھدر کا رومال تھا، جسے وہ تھوڑی دیر بعد دائیں ہاتھ سے نکال کر چہرے پر پھیرتے تھے۔ اسی جیب میں ایک کاغذ میں گڑ تھا جسے وہ دو دو تین تین منٹ کے بعد تھوڑا تھوڑا سا کھاتے تھے۔

فیروز پور سے جو لوگ مولانا سندھی سے ملنے گئے تھے، مولانا عطاء اللہ حنیف کے سوا سب احراری تھے۔ مولانا عطاء اللہ ضلع فیروز پور کی جمعیت علماے ہند کے صدر اور

شہر فیروز پور کی کانگریس کمیٹی کے نائب صدر تھے۔ مجلس احرار سے ان کا تعلق رکنیت کا نہ تھا البتہ مقامی مجلس احرار کے ارکان کی دعوت پر ان کی میٹنگوں میں شریک ہو جاتے تھے۔

تعارف کے بعد مولانا سندھی سے گفتگو کا آغاز ہوا تو انھوں نے چھوٹتے ہی جمعیت علمائے ہند کے علمائے کرام پر برسنا شروع کر دیا۔ فرمایا ملک میں دو ہی سیاسی جماعتیں ہیں؛ کانگریس اور مسلم لیگ۔ جس نے کوئی سیاسی کام کرنا ہو وہ ان دونوں جماعتوں میں سے اپنی پسند کے مطابق کسی ایک جماعت میں شامل ہو جائے۔ جمعیت علمائے ہند وغیرہ جماعتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ان جماعتوں کے مولوی لوگوں کو خراب کر رہے ہیں۔ میں کبھی برسر اقتدار آ گیا تو ان مولویوں کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔ اس پر انھیں صبر نہیں آیا تو فرمایا میں ان کی ڈاڑھیاں مونڈ دوں گا اور ان کو گولی سے اڑا دوں گا۔ اس قسم کا سلسلۂ کلام کئی منٹ چلا، وہ ان الفاظ سے ملتے جلتے الفاظ پوری تیزی اور خاص جذبے سے بولتے چلے جا رہے تھے۔ بعض علمائے کرام کے نام بھی لیے۔ مولانا بول رہے تھے اور سننے والے حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور اتنے بڑے عالم کیوں ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ اس زمانے میں علما کے خلاف کوئی بات سننے کے لوگ عادی نہیں تھے۔

ان سے اجازت لے کر ہم باہر نکلے اور واپسی کے لیے تانگے پر بیٹھے تو تبصروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو تبصرے ہوئے ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ قارئین کرام خود ہی اندازہ فرمالیں کہ اس نوع کے طرزِ کلام کے بارے میں اور اس قسم کی باتیں کرنے والے کسی شخص کے متعلق اگرچہ وہ کتنا ہی بڑا عالم اور مشہور امام ہو، لوگوں کی کیا رائے ہو سکتی ہے۔

یہ ان کی پہلی زیارت تھی جو اس عاجز نے کی۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا سندھی نے مولانا آزاد

سے جمعیت علماے ہند سے تعلق رکھنے والے علماے کرام کے بارے میں اسی قسم کی باتیں کی تھیں ۔ مولانا آزاد نے مسکراتے ہوئے ان سے فرمایا تھا کہ جب آپ کا بس چلے اور آپ کو اقتدار مل جائے تو اور کچھ کریں یا نہ کریں، ان کی ڈاڑھیاں ضرور مونڈ دیں، یہ اچھا مشغلہ ہے، اسے ہر صورت میں جاری رکھیں ۔

اس سے تقریباً تین سال بعد مارچ ۱۹۴۲ء میں کسی کام سے میں لاہور میں آیا تو چلتا پھرتا شیرانوالا گیٹ میں مولانا احمد علی صاحب کی مسجد میں پہنچ گیا ۔ وہاں مولانا سندھی اور مولانا احمد علی صاحب تشریف فرما تھے ۔ دو تین اور بزرگ بیٹھے تھے، جن میں سے ایک کو میں پہچانتا تھا وہ تھے مولانا داؤد غزنوی ۔ دوسرے صاحب کے بارے میں پتا چلا کہ یہ مجلس احرار کے ممتاز رہنما چودھری افضل حق ہیں ۔ میں ان حضرات سے تھوڑا سا دور ہٹ کر ایسی جگہ بیٹھ گیا، جہاں ان کی باتیں آسانی سے سنی اور سمجھی جا سکتی تھیں ۔

قصہ یہ تھا کہ چند روز بعد لاہور میں جمعیت علماے ہند کی کانفرنس مولانا سید حسین احمد مدنی کی صدارت میں ہو رہی تھی ۔ اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر مولانا احمد علی اور ناظم مولانا داؤد غزنوی کو بنایا گیا تھا ۔ لیکن مولانا سندھی چوں کہ جمعیت علماے ہند کے مخالف تھے اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ مولانا احمد علی اس میں کوئی منصب قبول کریں یا اس اجلاس میں کسی قسم کا حصہ لیں ۔ مولانا داؤد غزنوی اور چودھری افضل حق اس لیے مولانا سندھی کی خدمت میں آئے تھے کہ وہ مولانا احمد علی کو منصب قبول کرنے سے نہ روکیں، لیکن مولانا سندھی اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے ۔ وہ بار بار مولانا احمد علی کے بارے میں فرما رہے تھے کہ میرا بیٹا قرآن کی خدمت کر رہا ہے اور جمعیت کے سیاسی جھمیلوں سے الگ ہو کر لوگوں کو قرآن کی تفسیر پڑھا رہا ہے، آپ لوگ اس کے اصل کام میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں ۔ میں اپنے بیٹے کو اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ وہ قرآن کی خدمت کو چھوڑ کر جمعیت کے چند مولویوں کے

ساتھ چل پڑے۔

مولانا داؤد غزنوی اپنے دبنگ لہجے میں قدرے بلند آواز سے مولانا سندھی کو ان کے اعتراض نما فرمان کا جواب دے رہے تھے، لیکن چودھری افضل حق بمشکل حلق کے نیچے سے آواز نکال کر بہت ہی سست لہجے میں بات کرتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ (غالباً) گورکھپور جیل میں انگریزی حکومت نے کوئی ایسی چیز انھیں کھلادی تھی، جس سے ان کی قوت گویائی انتہائی متاثر ہو گئی تھی اور وہ تکلیف کے ساتھ نیچی آواز میں آہستہ آہستہ بات کرتے تھے۔مولانا احمد علی صاحب بالکل خاموش رہے۔پوری گفتگو میں انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔

مولانا سندھی نہیں مانے تو مولانا داؤد غزنوی نے ذرا ترش لہجے میں ان سے کہا کہ ہم آپ کے بیٹے کو ہندوستان کے طبقہ علما میں زیادہ سے زیادہ احترام کا مستحق قرار دینا چاہتے ہیں اور ان کے مرتبہ و مقام کو لوگوں کے سامنے مزید نمایاں کرنے کے خواہاں ہیں، لیکن آپ اس میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں۔مولانا نے اس قسم کی کئی باتیں کہیں، لیکن مولانا سندھی نے ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔اس کے بعد وہ دونوں حضرات وہاں سے اٹھ کر چلے گئے اور مولانا عبدالقادر قصوری سے ملے۔ان سے مجلس استقبالیہ کی صدارت قبول فرمانے کی درخواست کی۔وہ ان دنوں بیمار تھے، تاہم انھوں نے منظوری دے دی۔وقت مقررہ پر اجلاس شروع ہوا تو انھوں نے کھڑے ہو کر اپنے تحریری خطبہ استقبالیہ کی چند سطریں پڑھیں، پھر بیٹھ گئے اور ان کا پورا خطبہ ان کے صاحب زادے مولانا محمد علی قصوری (ایم۔اے کینٹب) نے پڑھا۔

یہ دوسرا موقع تھا کہ یہ فقیر مولانا سندھی کی زیارت سے بہرہ مند ہوا اور اسے ان کے ارشادات سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔

بلاشبہ مولانا سندھی بہت بڑے عالم دین اور ایک خاص مزاج و فکر میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ان کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا اور قرآن مجید کی ترجمانی

میں وہ ایک منفرد نقطہ، نظر رکھتے تھے۔ ان کی پوری زندگی چوں کہ جدوجہد میں گزری تھی اور وہ ہمشیہ جہاد و سیاست کے میدان میں رہے تھے، اسی لیے وہ قرآن مجید پر زیادہ تر اسی اسلوب میں غور کرتے تھے اور اس کے احکام کو جنگ و جہاد کی صورت میں پیش فرماتے تھے۔

مولانا سندھی کے بارے میں بہت سے اہل علم نے بہت کچھ لکھا اور بہت کچھ لکھیں گے، لیکن سب سے زیادہ پروفسیر محمد سرور جامعی نے لکھا ہے۔ انھوں نے ان کے افکار و تصورات کی خوب وضاحت کی ہے۔ بعض مقامات پر ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ سرور صاحب نے شاید خود اپنے افکار کو مولانا سندھی کی طرف منسوب کر کے بیان کیا ہے۔ ہم بعض اوقات ازراہِ مزاح کہا کرتے تھے کہ آپ نے مولانا سندھی کے افکار کی جس نہج سے ترجمانی کی ہے، شاید اس نہج سے وہ خود بھی نہ کر پاتے۔ اسی طرح مولانا سندھی نے جس اسلوب میں شاہ صاحب کے بعض افکار کی وضاحت کی ہے، اس سے خود شاہ صاحب بھی شاید آگاہ نہ ہوں گے۔ سرور صاحب ہماری اس قسم کی باتیں خوش ہو کر سنتے اور ہنس پڑتے۔ ان کی مسکراہٹ اور خوشی سے ہمیں اور کھل کر بات کرنے کا موقع ملتا۔ بہرحال معاملہ کچھ بھی ہو، اس میں شک نہیں کہ سرور صاحب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے مولانا سندھی کے متعلق لوگوں کو بہت مواد دیا ہے، جس کی تھوڑی سی تفصیل مندرجہ ذیل سطور میں بیان کی جاتی ہے:۔

(۱) مولانا عبید اللہ سندھی: یہ پہلی کتاب ہے جو مولانا سندھی کے بارے میں سرور صاحب نے تصنیف کی۔ اس میں ان کے حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار کی صراحت کی گئی ہے۔ یہ ۱۹۴۳ء میں طبع ہوئی تھی، جب کہ مولانا سندھی زندہ تھے اور یہ کتاب ان کے ملاحظہ، گرامی میں آئی تھی۔ اس کے مطالعے سے وہ بہت خوش ہوئے تھے چار سو ستر صفحات میں پھیلی ہوئی یہ کتاب انیس عنوانات پر مشتمل ہے۔ (۱) مقدمہ، (۲) حالاتِ زندگی، (۳) وحدتِ انسانیت، (۴) خدا پرستی، انسان دوستی، (۵) جہاد،

انقلاب، (۶) انسانیت کے بنیادی اخلاق، (۷) تصوف، (۸) اسلامی تصوف، (۹) نظریہ، تمدن، (۱۰) تاریخ اسلام پر ایک نظر۔ پس منظر اور ابتدائی دور، (۱۱) قومی حکومتوں کا دور (۱۲) قومی و ملکی رجحانات، (۱۳) اسلامی ہندوستان، (۱۴) اکبر اعظم، (۱۵) اورنگ زیب عالم گیر، (۱۶) شاہ ولی اللہ، (۱۷) ولی اللہی سیاسی تحریک، (۱۸) کانگریس، (۱۹) ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل۔

یہ کتاب سندھ ساگر اکادمی، لاہور نے شائع کی تھی اور یہ اکادمی خود سرور صاحب نے قائم کی تھی۔ پھر دسمبر ۱۹۵۵ء میں اس کتاب کی تلخیص شائع ہوئی، جس کا عنوان ہے "تعلیمات مولانا عبید اللہ سندھی"۔ تلخیص ۱۵۲ صفحات کو گھیرے ہوئے ہے۔

کتاب کے آغاز کے چند الفاظ جو سرور صاحب نے مولانا سندھی کی طرف منسوب کیے ہیں، نہایت دردناک ہیں۔ سچی بات ہے، یہ الفاظ پڑھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ الفاظ ملاحظہ ہوں:

"ایک دن مولانا بڑے مغموم سے تھے۔ فرمانے لگے کہ "میں مسلمانوں کو کام کی اور ضرورت کی باتیں کہتا ہوں لیکن وہ نہیں سنتے، بلکہ الٹا مجھے مطعون کرتے ہیں۔ مجھے دیکھو، میں سولہ برس کا تھا کہ گھر بار چھوڑ کر نکل آیا تھا۔ مانا کہ میرا خاندان بہت بڑا نہ تھا اور نہ ہمارے ہاں دولت کی فراوانی تھی، لیکن آخر میری ماں تھی، میری بہنیں تھیں اور ان کی محبت میرے دل میں جاگزیں تھی، لیکن اسلام سے مجھے اتنی محبت تھی کہ میں کسی محبت کو بھی خاطر میں نہ لایا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ماں کو چھوڑنے سے مجھے کس قدر ذہنی کوفت ہوئی۔" (یہ کہتے ہوئے مولانا آب دیدہ ہو گئے)۔

آپ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

"اسلام سے میری اس شیفتگی کا نتیجہ تھا کہ جو مجھے اسلام کی بات کہتا اور وہ بات میرے دل میں بیٹھ جاتی، تو میں اس کا دل و جان سے گرویدہ ہو جاتا۔

یہ کتاب مولانا سندھی سے متعلق بہت سے اہم عنوانات کو اپنے دامنِ صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے۔

(۲) کابل میں سات سال: مولانا سندھی اکتوبر ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۲ء تک کابل میں رہے۔ یہ ان کی سیاسی اور تحریکی زندگی کا نہایت اہم دور تھا۔ یہ ایک تاریخی یادداشت ہے جو سرور صاحب نے مرتب کی ہے۔ اس میں عجیب و غریب انکشافات کیے گئے ہیں اور بہت سے ملکی و غیر ملکی سیاسی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ بہت سی اہم شخصیتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعض مندرجات سے مولانا کی رائے سے نہایت ادب کے ساتھ اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت بڑی خدمت ہے جو سرور صاحب نے انجام دی ہے اور مولانا سندھی کی کابل کی سات سالہ تگ و تازِ مجاہدانہ کو کتابی شکل دے کر قارئین کے سامنے معلومات کے بند کواڑ کھول دیے ہیں۔ یہ کتاب بھی سندھ ساگر اکادمی، لاہور نے شائع کی ہے اور ۱۶۰ صفحات پر محیط ہے۔

(۳) خطبات و مقالات مولانا عبید اللہ سندھی: اس کتاب کا ایک مقدمہ ہے جو سرور صاحب کا تحریر کردہ ہے اور ۶۱ صفحات پر محیط ہے۔ اس میں مولانا سندھی کے افکار و نظریات کے بعض ضروری پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ صفحہ ۶۶ سے لے کر صفحہ ۹۷ تک (اٹھارہ صفحات میں) مولانا کے خودنوشتہ حالات زندگی ہیں۔ اس سے آگے ان کے پانچ خطبے ہیں جو انھوں نے ہندوستان تشریف لانے کے بعد مختلف مقامات پر دیے۔ تفصیل یہ ہے؛

۱۔۔۔ خطبہء صدارت؛ علمائے صوبہ بنگال کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں ۳۔جون ۱۹۳۹ء کو پڑھا گیا۔

۲۔۔۔ خطبہء افتتاح؛ ٹھٹھہ (سندھ) ضلع کانگریس کمیٹی کانفرنس منعقدہ ۱۲۔جولائی ۱۹۴۰ء میں پڑھا گیا۔

۳۔۔۔ خطبہء صدارت؛ صوبہ مدراس کے مقام کمیا کونم میں اینٹی سیریشن کانفرنس

منعقدہ جون ۱۹۴۱ء میں پڑھا تھا۔

۴ ... خطبہ، صدارت؛ جو حیدر آباد کی جمعیت طلبائے سندھ کے اجلاس منعقدہ ۱۷۔ اپریل ۱۹۴۴ء کو پڑھا۔

۵ ... خطبہ، شہداد کوٹ (سندھ)؛ جمعیت طلبائے سندھ کے لیے مولانا نے اپنے دستِ مبارک سے لکھا اور خود ہی چھپوا کر ایک طالب علم کے ہاتھ وہاں بھجوا دیا۔ ۲۲۔ اگست ۱۹۴۴ء کو مولانا وفات پا گئے۔ یہ ان کے ہاتھ کی آخری تحریر ہے۔

اس میں آٹھ مقالات ہیں جو مختلف مسائل کے متعلق اشاعت پذیر ہوئے۔

مقالات کے عنوان یہ ہیں:

۱۔ جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی کا قیام

۲۔ جمعیت خدام الحکمت۔

۳۔ قومی اجتماع ہند، نیشنل ہے یا انٹر نیشنل؟

۴۔ ہم کیا چاہتے ہیں؟

۵۔ جامعہ ملیہ دہلی میں یادگار شیخ الہند کا افتتاح۔

۶۔ بیت الحکمت (حکمت الامام ولی اللہ دہلویؒ)

۷۔ ایک تاریخی سیاسی منشور۔

۲۸۸ صفحات کی یہ کتاب پروفیسر محمد سرور جامعی نے ترتیب دے کر سندھ ساگر اکادمی، لاہور کی طرف سے شائع کی۔

(۴) افادات و ملفوظات، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی: یہ چوتھی اور آخری کتاب ہے جو سرور صاحب نے مولانا سندھی کے بارے میں لکھی۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۷۲ء میں طبع ہوئی تھی۔ کتاب کا آغاز سرور صاحب نے مولانا سندھی کے ان الفاظ سے کیا ہے:

"دیکھو! مجھے دیوبند سے کتنی محبت ہے اور میں کتنا سخت دیوبندی

ہوں۔ میں مولانا محمد قاسم اور شیخ الہند کا نام لیتے نہیں تھکتا۔ مجھے ان بزرگوں سے بے حد عقیدت ہے اور میں اپنی علمی و دینی زندگی کو انھی کا فیض سمجھتا ہوں۔ اب میں دیکھ رہا ہوں کہ زمانہ بدل رہا ہے اور دیو بند کا نظام تعلیم اسی فرسودہ ڈگر پر چل رہا ہے۔ میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ موجودہ دیو بندی بعض لغویات میں مبتلا ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر یہی حالات رہے اور دیو بند میں ضروری اصلاح نہ ہوئی تو اس دار العلوم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔"

"میں ان لغویات کے خلاف آواز اٹھاتا ہوں، جن کی زد ان اشخاص پر پڑتی ہے۔ وہ اپنے مفاد کی خاطر مجھے دیو بند کا دشمن، گمراہ اور سر پھرا قرار دیتے ہیں، حالاں کہ میں دیو بند کا بھلا چاہتا ہوں۔ اپنے استادوں کے لگائے ہوئے پودے کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسی فیض علمی و دینی کو جاری و ساری رکھنے کا آرزو مند ہوں۔ میرے نزدیک ضروری اصلاحات کے بغیر یہ چیزیں ممکن نہیں۔"

مولانا سندھی کے ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے ہم مسلک دیو بندی علماے کرام نے ان کے ہندوستان تشریف لاتے ہی ان کی شدید مخالفت کرنا شروع کر دی تھی اور مولانا کے فرمان کے مطابق وہ انھیں "دیو بند کا دشمن، گمراہ اور سر پھرا قرار دینے لگے تھے۔

کتاب کی ابتدا میں سرور صاحب نے مولانا سندھی کے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں:

"یہ جو تاریخ اسلامی میں تم اکثر پڑھتے ہو کہ فلاں ملحد تھا، فلاں زندیق تھا، فلاں نے اسلام کو یوں گزند پہنچایا، فلاں سے مسلمانوں کو یوں گزند پہنچا، وغیرہ وغیرہ۔ تو یاد رکھو ان میں سے اکثر ایسے تھے جو اپنے اپنے زمانے میں مروجہ مفاسد کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بر سر اقتدار طبقے کے مفادات پر اس سے زد پڑتی تھی، چناں چہ اس کی طرف سے ان کے خلاف مذہبی حربہ استعمال کیا گیا اور اس کے جواب میں بھی مذہب ہی میدان میں آیا۔ اس طرح معاشرتی،

سیاسی اور اقتصادی اصلاح کی کش مکش مذہبی کش مکش بن گئی اور ایک دوسرے کو ملحد اور زندیق ٹھہرایا گیا۔ اسلام میں مذہبی فرقوں کی ابتدا اسی طرح ہوئی اور الحاد و زندقہ کا چکر یوں چلا۔"

مولانا سندھی کے نظریات کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے دوستوں، معاونوں اور تعلق داروں کا تذکرہ بھی اس میں کیا گیا ہے۔ نیز مختلف اوقات میں یہ جن حالات و کوائف سے دوچار ہوئے اور جن مشکل یا آسان منزلوں سے گزرے، اس کا ذکر بڑے موثر اسلوب میں اس کتاب میں ملتا ہے۔ ۵۱۲ صفحات کی یہ ضخیم کتاب سرور صاحب نے بڑی محنت سے ترتیب دی ہے۔ کتاب میں لائق مصنف نے مولانا کے پورے عہد کو قارئین کے سامنے لا کھڑا کیا ہے اور ان کی سرگرمیوں کی مکمل تصویر کھینچ دی ہے۔

سرور صاحب بڑے محنتی اور ان تھک کام کرنے والے تھے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر چھوٹی بڑی بائیس کتابیں تصنیف کیں اور متعدد اخبارات و رسائل میں خدمات سرانجام دیں۔ ان کی زندگی سراپا عمل و حرکت تھی۔

سرور صاحب کے ایک صاحب زادے ابوظہبی میں مقیم تھے۔ ستمبر ۱۹۸۳ء میں وہ بیٹے کی ملاقات کے لیے ابوظہبی گئے۔ ۱۹۔ ستمبر کو رات کے کھانے پر وہ ہندوستان کے سفیر متعینہ ابوظہبی کے ہاں مدعو تھے۔ کھانے کے بعد وہاں بیٹھے مختلف حضرات سے باتیں کرتے رہے۔ بیماری یا تکلیف کے قطعاً کوئی آثار نہ تھے۔ واپس گھر آئے تو آدھی رات کے قریب دل کا دورا پڑا۔ اسی وقت ڈاکٹر سے رجوع کیا گیا لیکن زندگی کا سفر ختم ہو چکا تھا۔ یہ ۱۹۔ اور ۲۰۔ ستمبر ۱۹۸۳ء کی درمیانی شب تھی۔ ۲۱۔ ستمبر کو لاہور کے اخبارات میں ان کی وفات کی خبر پڑھی تو نہایت افسوس ہوا اور ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۳ء تک تینتیس برس میں پھیلی ہوئی بہت سی یادیں لوح ذہن پر ابھر آئیں۔

۲۲۔ ستمبر کی صبح کو ان کی میت لاہور پہنچی اور انھیں ان کے گھر کے قریب ٹاؤن شپ کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

امامِ انقلاب

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

سید اکبر شاہ ہاشمی

سید اکبر شاہ کا نام پروگرام میں شامل نہیں تھا، اس لیے ان کا مضمون آخر میں شامل کیا جاتا ہے (ا۔س)۔

مولانا عبید اللہ سندھی تحریکِ آزادیٔ وطن کے ہیرو، تحریکِ ریشمی رومال کی اہم شخصیت اور بہت بڑے انقلابی تھے۔ انھیں عام طور پر امام انقلاب کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ پنجاب کی ایک بستی چیاں والی سیالکوٹ میں ۱۰۔ مارچ ۱۸۷۲ء کو ایک غریب سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ باپ کا انتقال پیدائش سے تقریباً چار ماہ پہلے ہو گیا تھا۔ ان کی پیدائش پر ماں خوش ہوئی کہ اللہ نے بیٹا عطا فرمایا، بہنیں خوشی سے جھوم اٹھیں کہ بھائی کی محبت میسر آئی، ماموں نے سکھ کا سانس لیا کہ بیوہ بہن کو بیوگی کا سہارا ملا۔ لیکن انھیں معلوم نہ تھا کہ مشیت ایزدی ان سے کیا کام لینا چاہتی ہے۔ رب ذوالجلال ان سے دین اسلام کی خدمت اور وطن کی آزادی کا کام لینا چاہتا تھا، اس کے لیے اس نے ان کی دینی اور سیاسی تربیت کا انتظام کر دیا۔

مولانا سندھی نے ایک نو مسلم مولانا عبید اللہ کی کتاب "تحفتہ الہند" سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ اس لیے اپنا نام عبید اللہ کتاب کے مصنف کے نام پر رکھا۔ یہ امام انقلاب مولانا سندھی تھے، جو ساری زندگی انگریز کے لیے خطرے کا نشان بنے رہے۔ انھوں نے چوبیس سال تک خدا کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے آزادی دلانے کے لیے در در کی خاک چھانی۔ ایک مفتی صاحب نے ان سے پوچھا کہ ۲۵ سالہ جلاوطنی کی زندگی میں آپ پر کبھی عیش و عشرت کے کچھ دن آئے؟ تو مولانا سندھیؒ نے

فرمایا کہ مفتی صاحب! یقین کیجیے، اس پوری مدت میں ایک شب بھی ایسی نہیں آئی جس میں میں چین کی نیند سویا ہوں۔ ہندوستان پہنچنے کے بعد پہلی مرتبہ سکون کی نیند سویا ہوں۔

ان کی زندگی مشکلات و امتحانات کی زندگی تھی۔ وہ ایک درویش صفت انسان تھے۔ انھوں نے اپنے شیخ سے آزادی و حریت کا سبق سیکھا تھا اور ہمیشہ شیخ الہند کے فرمانے پر سخت سے سخت کام کرنے پر آمادہ نظر آئے۔ وہ فقر و فاقہ میں حضرت ابوذر غفاریؓ کا نمونہ تھے۔ وہ ملک پر پھیلے ہوئے غاصب و ظالم انگریز اور اس کے ظلم و استبداد کے خلاف ایک مضبوط چٹان تھے۔ جب امام سندھیؒ نے حضرت شیخ الہند کے پروگرام کو آگے بڑھانے اور تحریکِ آزادی میں کام کرنے کا تہیہ کر لیا تو انھیں بہت مصائب کا سامنا کرنا پڑا، انھیں راستے سے ہٹانے کے لیے سخت آندھیاں اٹھیں، احباب مارِ آستین بن گئے۔ بزرگ ناصح بن کر سدِ راہ بنے لیکن وہ اللہ کا نام لے کر اور کسی مخالفت اور رکاوٹ کی پروا کیے بغیر وقت کے ہولناک طوفان کے مقابلے میں آ کھڑے ہوئے اور اس شان سے ملک کی سیاسی رہنمائی کی کہ وطن عزیز کی تحریکِ آزادی کی بیڑا کنارے آن لگا۔ مولانا سندھی نے شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال کو اس انداز سے آگے بڑھایا کہ انگریز انھیں کو تحریک کا اصل بانی سمجھنے لگا۔

مولانا سندھی شیخ الہندؒ کے خاص شاگرد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بے مثال اور اعلیٰ ذہنی و فکری صلاحیتیں اصابت رائے، تدبر اور ہمت و استقلال عطا فرمایا تھا۔ مولانا نے "جمعیۃ الانصار" دیوبند میں تین سال تک کام کیا اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کے فرمانے پر دہلی تشریف لے گئے، جہاں آپ نے "نظارۃ المعارف القرآنیہ" کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ شیخ الہندؒ کا مجھے دہلی بھیجنے کا مقصد نوجوان قیادت سے ملانا تھا۔ دہلی میں تقریباً دو سال تک رہ کر مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاسی قیادت سے واقف ہونے کا موقع ملا۔

آپ دہلی اس مقصد کے لیے گئے تھے کہ نوجوانان اسلام کے عقائد اور نظریات

پر جو لادینی فلسفہ اثر کر رہا ہے اسے زائل کیا جائے اور قرآن و سنت کی تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ دین اسلام کے بارے میں ان کے دلوں کے شکوک و شبہات دور ہو جائیں اور وہ پکے اور سچے مسلمان بن جائیں ۔ حضرت شیخ الہندؒ انگریز کی چالوں اور عیارانہ طریقوں کو بھانپ چکے تھے ۔ وہ دہلی تشریف لے گئے اور امام سندھیؒ سے ملاقات میں فرمایا:

"جب تک انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہے، جتنی مدت میں تم اپنی اس تعلیم اور مدرسہ سے دس، بیس آدمی صحیح الخیال مسلمان بناؤ گے تو اس مدت میں انگریز ہزاروں لاکھوں کو ملحد اور زندیق بنا دیں گے ۔"

مولانا عبید اللہ سندھی حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے آزادیٔ وطن کے پروگرام کو لے کر ۱۹۱۵ء کو افغانستان تشریف لے گئے ۔ کابل کے سفر سے پہلے وہ کئی بار سرحد، یاغستان اور سندھ کا دورہ کر چکے تھے تاکہ انقلاب کے لیے زمین ہموار کی جائے اور اسی اسلامی انقلاب کو برپا کرنے کے لیے آپؒ نے کابل میں ایک پروگرام بنایا تھا، لیکن افسوس کہ راز افشاں ہو گیا اور تحریک ناکام ہو گئی ۔ مولانا سندھی کا یہی پروگرام تھا جسے "ریشمی رومال تحریک" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔

کابل سے مولانا سندھی ۱۹۲۲ء میں روس کے لیے عازم سفر ہوئے ۔ تقریباً سات ماہ تک انقلابی روس کے دار الحکومت ماسکو میں قیام رہا ۔ اس کے بعد روس سے ایک معاہدے کے بعد ایک انقلابی منصوبے کے تحت ترکی تشریف لے گئے اور تین سال تک استنبول میں قیام کر کے یورپ کی سیاست کا مطالعہ کرتے رہے ۔ ترکی میں قیام کے دوران میں انھوں نے آزاد ہندوستان کے لیے ایک پروگرام مرتب کیا لیکن ہندوستان میں اس کے داخلے پر پابندی لگا دی گئی ۔ ۱۹۲۶ء میں مولانا مکہ معظمہ تشریف لے گئے، جہاں تقریباً بارہ سال تک درس قرآن اور فلسفہ ولی اللہیؒ کے ذریعے آپؒ تشنگان علم کی پیاس کو بجھاتے رہے ۔ ۱۹۳۸ء میں آپ کو وطن واپس آنے کی اجازت مل گئی ۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں وہ اس خیال سے وطن لوٹے کہ ہندوستان میں ایک ایسی تحریک

پیدا کرنی چاہیے، جو غریبوں کے حقوق کی ضامن ہو۔

۲۵ سالہ طویل جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد اپنے ہم وطنوں کو ایک پیغام میں کہا:

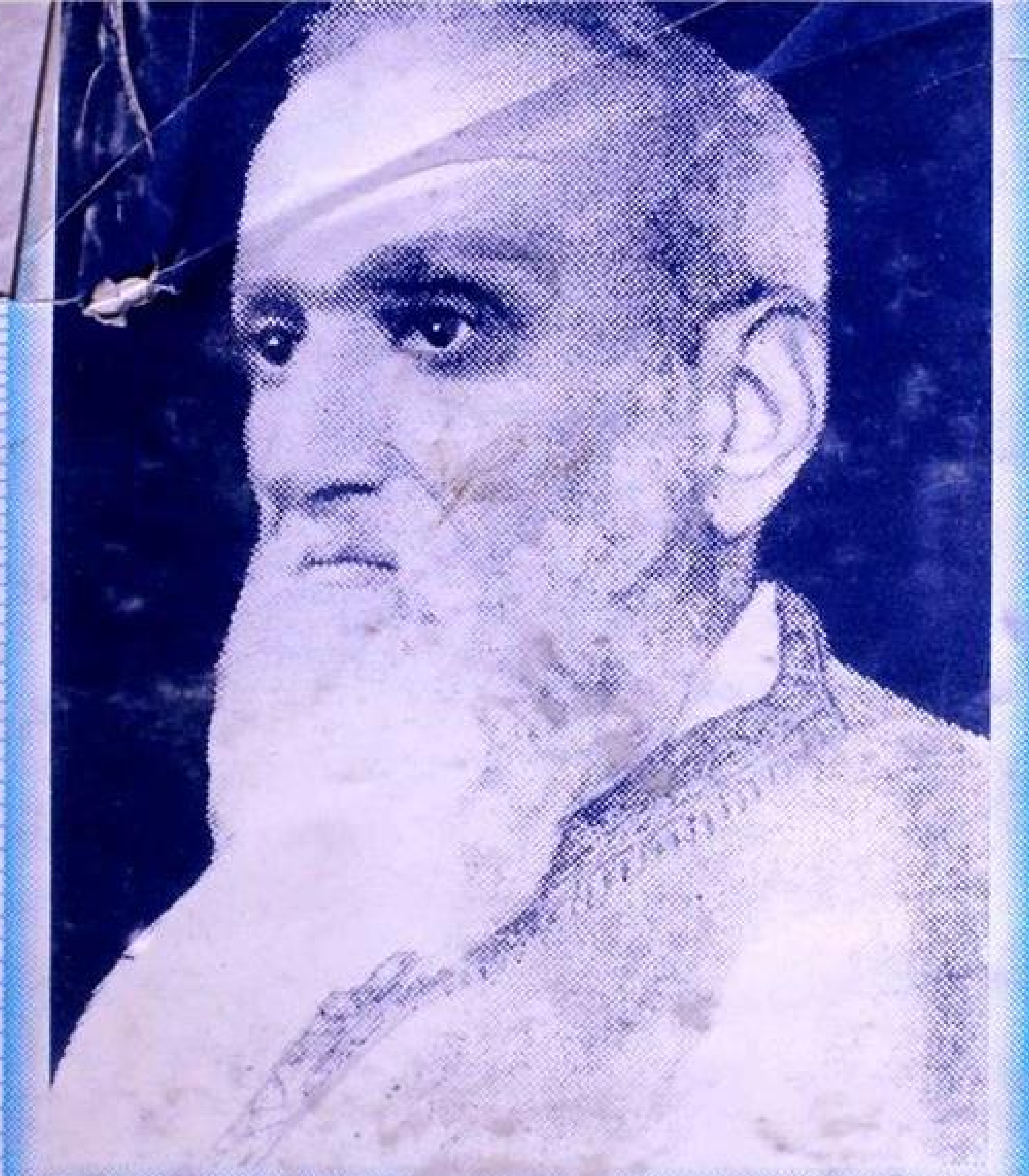
"سوشل ازم کے مطالعے سے میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ کی شاخ ہے، اس کے لادینی حملے سے محفوظ کرنے کی سوچنے میں کامیاب ہوا۔ اگر مجھے ان کی مدد نہ ملتی تو میں اس تخصیص اور امتیاز کو کبھی حاصل نہ کر سکتا۔"

علمائے بنگال کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں اپنے خطبہ۔ صدارت میں مولانا نے فرمایا:

"میں نے شیخ الہند کے حکم پر ۴۔ شوال ۱۳۳۳ھ کو ہندوستان چھوڑا اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خواہش پر اوائل ۱۳۵۸ھ میں واپس آیا۔ اس عرصے میں ایسے حالات سے دوچار ہوتا رہا ہوں کہ کبھی موت کے منہ میں جا کر بچ نکلا اور کبھی غلبہ۔ یاس کے برے اثرات سے بچنے کے لیے ایسی جماعتوں سے متحد ہو کر کام کرنے کے بارے میں سوچتا رہا جن سے بحالتِ اطمینان شاید معمولی طور پر ملنا بھی جائز نہ سمجھتا۔"

مولانا سندھیؒ نے اپنا موقف بیان فرمایا ہے کہ روس جانا مجبوری تھی، نہ کہ میں ان کے نظام یا فکر سے متاثر ہوا تھا۔ جن کا خیال یہ ہے کہ مولانا متاثر ہوئے تھے وہ ایک عظیم غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ مولانا سندھیؒ کا فکر مستحکم اور اسلام پر ان کا ایمان غیر متزلزل تھا۔ انھوں نے اپنی تحریروں کا اپنے پیچھے ایک گراں بہا خزانہ چھوڑا ہے۔

دنیا کا یہ عظیم انسان جس کی پرجوش اور ولولہ انگیز قیادت سے مسلمانان ہند کو ایک نیا عزم و حوصلہ ملا تھا، ۲۲۔ اگست ۱۹۴۴ء کو تقریباً ۷۲ سال کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ اللھم اغفرلہ



آنے والے انقلاب کے ان نتائج بد سے بچنا چاہتے ہو تو خود اپنے قومی ضمیر سے انقلاب کا فکر پیدا کرو اور اس انقلابی فکر کا اپنے فکر سے ڈھانچا بناؤ۔ اس سے یہ ہوگا کہ ایک تو تم دوسروں کی دیکھا دیکھی تقلیداً انقلابی نہیں بنو گے اور دوسرے تمہارا انقلاب تمہارے عام اہل وطن کے لیے ایک عجوبہ بن کر نہیں رہ جائے گا، بلکہ انقلاب خود تمہارے باطن سے پھوٹے گا۔ وہ تمہارے طبعی تقاضوں کا نتیجہ ہوگا، اس کی شکل اور ہیئت ملک کے حالات اور اس کی روایات کے مطابق ہوگی اور اس کی صورت یہ ہے کہ خود اپنی تاریخ سے انقلاب کی روح اخذ کرو۔ انقلاب کا فکر اور عمل کسی خاص ملک، کسی خاص قوم اور کسی خاص مذہب کا اجارہ نہیں۔ انقلاب اتنا ہی ہمہ گیر ہے جتنی کہ خود زندگی ہے۔ تم زندگی کی فعال قوتوں سے نقلاب کا سبق سیکھو اور اپنی تاریخ کے انقلابی ادوار کو اپنا مطمع نظر بناؤ، جو اس میں غیر انقلا[illegible] انھیں چلتے ہوئے کارواں کی گرد راہ سمجھو۔

[illegible]ولانا عبید اللہ سندھی